رومان

قلم تحریر

اختر شیرانی　　عاشق بٹالوی

۱۰ ـ فلیمنگ روڈ ـ لاہور

Price As. 6

مرتبہ

عالیجناب کرنل بھولاناتھ صاحب بہادر آئی ایم ایس سی آئی ای آنریری فزیشن شہنشاہ جارج پنجم

مذکورہ تمام علوم کی روشنی میں مردانہ و زنانہ امراض پر بحث کی گئی ہے

معالجات قدیمہ و جدیدہ کا نادر مجموعہ، ۵۰ سالہ پریکٹس کے تجربات کا نچوڑ

اردو ولٹریچر تو درکنار انگریزی زبان میں بھی اب تک ایسی بلند رتبہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ حجم ۴۰۲ صفحات۔ قیمت تین روپے محصول ۸/

روزانہ زمیندار لاہور۔ ۱۹ جون ۱۹۳۴ء
کتاب مذکور کی زبان نہایت شستہ اور رنگین ہے اور اسلوب بیان نہایت سلجھا ہوا ہے

روزانہ پرتاپ لاہور۔ ۷ مئی ۱۹۳۴ء
دو مختلف طریق علاج قدیم و جدید کا ایک نادر مجموعہ ہے۔

روزانہ ملاپ۔ مورخہ ۹ مئی ۱۹۳۴ء
یہ کتاب حکیموں، ڈاکٹروں، ویدوں کے لئے چراغ ہدایت ثابت ہوگی۔

روزانہ ویر بھارت۔ مورخہ ۸ مئی ۱۹۳۴ء
یہ کتاب ہر لحاظ سے تمام موجودہ کتابوں سے جداگانہ شان رکھتی ہے۔

ہفتہ وار پیغام سرحد ہری پور ہزارہ ۱۴ مئی ۱۹۳۴ء
طب قدیم و جدید دونوں کے جواہر ریزوں کا انتخاب ہے۔

اخبار کشمیری۔ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۳۴ء
اس موضوع کی بے مثال کتاب ہے۔

ترجمان سرحد پشاور۔ مورخہ ۷ مئی ۱۹۳۴ء
کتاب اس موضوع پر عالمانہ تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔

رسالہ ہمایوں لاہور بابت ماہ جون ۱۹۳۴ء
یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی قابلیت اور تجربے کی شاہد ہے۔

پرتاپ (ہندی) کانپور۔ ۱۷ جون ۱۹۳۴ء
جو کچھ لکھا گیا ہے سمجھا کر لکھا گیا ہے۔

ویش اپکارک مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۳۴ء
اردو دان ویدوں، حکیموں کو ڈاکٹری نکتہ نگاہ ضرور اس کتاب سے دیکھنا چاہیئے۔

رسالہ الطبیب لاہور بابت ماہ مئی ۱۹۳۴ء
نہایت مفید کتاب ہے اور جناب کرنل صاحب کا اسم گرامی ہی اس کی خوبیوں کا پروانہ ہے

رسالہ شمس الاطباء۔ لاہور۔ ماہ جون ۱۹۳۴ء
ہم ناظرین سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ کتاب مذکور سے فائدہ اٹھائیں۔

اخبار گور و گھنٹال مورخہ ۲۶ مئی ۱۹۳۴ء
ہماری رائے میں جو لوگ پوشیدہ بیماریوں کے شاکی ہیں وہ اشتہاری دواؤں پر روپیہ ضائع کرنے کی بجائے اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں۔

پریکٹیکل میڈیسن دہلی بابت ماہ مئی ۱۹۳۴ء
امراض مخصوصہ کو بیان کرنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ جو آج تک کسی مشرقی یا مغربی مصنف نے اختیار نہیں کیا۔

مشیر الاطباء۔ بابت جولائی ۱۹۳۴ء
حفاظت کا ڈاکٹری علاج نہایت مکمل اور بہترین طریق پر بیان کیا گیا ہے

ملنے کا پتہ: کتب خانہ لطف زندگی موچی دروازہ لاہور

اکابرین کی آراء کا خلاصہ

رائے بہادر ڈاکٹر جیون لعل ایم ڈی۔ سی آئی ای، میوہسپتال لاہور
کتاب مفید، زیب اور بہت دلچسپ ہے۔

خانصاحب فضل حق ایم اے پی ایچ ڈی، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور
یونانی اور ڈاکٹری کے دو نو مضامین کو پہلو بہ پہلو ایک ہی کتاب میں لکھنا قابل تعریف ہے۔

خانصاحب ڈاکٹر یار محمد خان ایم ڈی، پروفیسر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور
اس بلند پایہ اور قابل مطالعہ کتاب کی تالیف کیلئے مصنف مبارکباد و تحسین کا مستحق ہے

مسٹر منوہر لعل ایم اے بیرسٹر، سابق وزیر تعلیم پنجاب
خلیفہ شجاع الدین بیرسٹر ایل ایل ڈی
کرنل بھولاناتھ کی کتاب معقولیت، اختصار اور سلاست کے لئے قابل قدر ہے۔

لالہ دیوان چند شرما ایم اے، پروفیسر ڈی اے وی کالج لاہور
میں تمام اصحاب کو جو تندرست زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتا ہوں

لالہ کنور سین صاحب ایم اے بیرسٹر، سابق پرنسپل لاء کالج لاہور۔
یہ کتاب اردو زبان میں قیمتی اضافہ ہے۔

گزارہ
روزگار میں کامیابی
حاصل کرنے کیلئے آپ اپنی تعلیم حاصل کرنے میں اور
اپنی کوشش کرتے ہیں مگر سولہ آنہ پورا خاوند بننے
کیلئے آپ کچھ بھی کوشش نہیں کرتے چلو گزارہ ہو جاتا ہے
گھر میں تو بیوی خاوند تو کہلاتے ہی ہیں۔ یہ ہے آپ کا خیال
سچ مانئے
باتصویر
ہدایت نامہ خاوند
کی کارآمد نصیحتوں، راز کی باتوں اور عملی ہدایتوں کی آپ کو
اشد ضرورت ہے اپنے شہر کے کتب فروش یا بذریعہ ذیل پتہ
سے ہدایت نامہ خاوند مجلد باتصویر پانچواں ایڈیشن طلب
کریں یقیناً آپ اسے پڑھ کر بہت ہی مفید پائیں گے
قیمت ایک روپیہ ڈاک خرچ ۴ر
پتہ: کویراج ہری نام داس بی اے لاہور

پروفیسر
کی غلط فہمی
جب اشتہار پڑھا ایک گھڑی سی ہوتی
کہ منگاؤں پھر کہتا شاید کوئی بازاری کتاب
ہو گی۔ کبھی کہتا مجھے اس کتاب کی ضرورت ہی
کیا ہے مگر اس دن ایک دوست سے تعریف سن کر
منگا ہی لی کویراج صاحب! تہ دل سے مشکور ہوں کہ
ہدایت نامہ خاوند
بلا مبالغہ بہترین کتاب ہے جو میرے مطالعہ میں
آئی ہر پیر و جوان اس سے بے حد فائدہ حاصل کرے گا
ازراہ کرم ایک جلد ہدایت نامہ بیوی
محمد اقبال ایم اے تاج محل ہوٹل بمبئی
مشتہر
کویراج ہری نام داس بی اے لاہور

اشاعت اکتوبر ۱۹۳۳ء

سلک مضامین

علامہ نظم اور ڈاکٹر رسوا کی یاد میں

خیابان کی ترتیب کے وقت ہماری نگاہیں علامہ نظم اور مرزا رسوا کو ڈھونڈھ رہی ہیں لیکن ہم اُن کو کہاں پائیں سہ

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

علامہ نواب حیدر یار جنگ سید علی حیدر نظم طباطبائی اور ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا قدیم اسکول شاعری کی یادگار اور مغتنمات روزگار تھے جن کے اُٹھ جانے کے بعد نعم البدل کی کوئی توقع نہیں ان کی موت دو بڑے شاعروں، دو بڑے ادیبوں اور دو بڑے عالموں کی موت نہیں ہے بلکہ درحقیقت اس کو "قوم" کی موت سمجھنا چاہیے۔

اگر نظم کے ساتھ ہمارا ایک باکمال ادیب و شاعر جس نے قدیم و جدید شاعری کے دامنوں کو اپنے جواہر افکار سے بھرا، ایک محقق جس نے تحقیق و تدقیق میں اپنی عمر کاٹی، اور علوم والسنۂ مشرقیہ کا مجتہد خاک کے تودوں میں نہاں ہوگیا تو رسوا کے ساتھ نہ صرف ایک سحر بیان شاعر ادیب، فلسفی محقق، بلکہ علوم مشرق و مغرب کا ماہر، فنون لطیفہ کا نقاد اور اُردو مختصر نویسی کا موجد پیوند خاک ہوگیا۔

اہل کمال کی موت فنائے عناصر تک محدود نہیں بلکہ ان کی حقیقی موت ان کے کارناموں کے گرد آلود ہونے میں مضمر ہے، نظم کی تصانیف تو طبع بھی ہوئیں اور مقبول نظموں کا ایک مجموعہ مکتبۂ ابراہیمیہ دکن سے شایع بھی ہو رہا ہے لیکن رسوا کے دور آخر کی غیر مطبوعہ تالیفات اور کثیر ملفوظات جو ان کے پاس مرتے دم تک منتشر پڑے تھے اور جو ابد دنیائے ادب کا گراں بہا ورثہ ہیں اُن کو ترتیب دینے اور شایع کرنے والا کوئی نہیں۔ رہے نام اللہ کا!

خیابان

بنام خدائے زباں آفریں

دامانِ باغبان و کفِ گلفروش

اعتذار یا اعتراف

اُردو رسائل کی تعداد کسی اضافہ کی متحمل نہیں، ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں جہاں اُردو بولی جاتی ہے ادبی ذوق بھی موجود ہے، سری نگر سے سنگاپور اور چاٹگام سے کراچی تک ملک کے طول و عرض میں مختلف مقامات پر اُردو کے رسائل و اخبارات شایع ہوتے ہیں، لیکن یہ مذاق سلیم ہے یا کیا؟ کچھ بھی ہو، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ ہمارے ادبی رسائل نے بحیثیت مجموعی وہ نہیں کیا جو ان کا نصب العین تھا، منزل مقصود کیا تھی اور بھٹک کدھر گئے۔ ادبی خدمت کی آڑ میں بے کیف اَنوکھی شاعری کا طبل شہرت بجایا گیا اور ادب سوز زبان کی اشاعت کیگئی۔ اُردو ہمارا پیدائشی حق ہے اور اسی حق کی حفاظت ہمارا فرض اولیں، یہی خیابان کا لائحہ عمل تھا اور ہے۔ اردو اسوقت بھی تہی دست ہے اسکے پاس تھا ہی کیا، جو کچھ تھا وہ بھی نہیں رہا جو ہے وہ گنج پنہاں، ہماری کوشش ہوگی کہ ہم اپنی زبان و ادب کے دامن کو علوم مشرقیہ و مغربیہ کے جواہر سے بھر دیں اور اسکے مدفون خزائن کو جوہر شناس نظروں کے سامنے پیش کر دیں۔ چھوٹا منھ بڑی بات، سچ تو یہ ہے کہ یہ کام ہماری بساط کے باہر ہے۔ تاہم اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہوگئے تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے اُس فرض کو ادا کر دیا جسکا ہماری زبان ہم سے مطالبہ کرتی ہے کاش ہماری تمنا پوری ہو سکے!

ہندوستانی اکاڈیمی اور اسکا مرکز

حکومت صوبہ جات متحدہ کی سرپرستی میں اُردو و ہندی زبانوں کی ترقی و اصلاح کے لیے جو انجمن ہندوستانی اکاڈیمی کے نام سے ملک کے مایۂ ناز فرزند اور فاضل ادیب و مقنن سر ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کی صدارت میں قائم ہے اسکا مرکز الہ آباد ہے

الہ آباد کا انتخاب نہ معلوم کن حقوق کی بنا پر کیا گیا ہے۔ کیا اس وجہ سے کہ وہ لسان العصر یادش بخیر حضرت اکبر مغفور کی آرامگاہ ہے۔ یا اسوجہ سے کہ پریاگ گنگا وجمنا دو مقدس دریاؤں کا سنگم ہے؟ اور اس سے فال یہ لی گئی ہے کہ جسطرح گنگا وجمنا الہ آباد کی آغوش میں بغلگیر ہوتے ہیں اسیطرح ہندوستان کی دو ممتاز ترین زبانیں اور ادب ایکدوسرے میں مدغم ہو سکیں گے۔ اگر یہ وجوہ نہیں تو پھر یہ سبب ہوگا کہ الہ آباد چونکہ برائے نام صوبہ متحدہ آگرہ واودھ کا دارالحکومت ہے اسوجہ سے ایسی انجمن کا مرکز جسکا قیام حکومت کے سایہ عاطفت میں عمل میں آیا ہے الہ آباد ہی ہو۔ لیکن جہانتک زبان وادب کی خدمت کا تعلق ہے الہ آباد کا کوئی کارنامہ نظر نہیں آتا۔ دہلی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ نے اردو کو اپنی گود میں لیا۔ اسکی تربیت کی اسکو پروان چڑھایا پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ لکھنؤ کے حقوق کو نظر انداز کر کے اردو کی اصلاح وترقی کی انجمن کی علمی جدوجہد کو الہ آباد کے عرض طول میں محدود رکھا جائے۔ اسیطرح الہ آباد کو ہندی سے بھی کوئی ربط نہیں۔ ہمارے صوبہ جات میں اگر کسی مقام کو ایک مرکزی ہندی ادارہ کے صدر مقام بننے کا استحقاق حاصل ہے تو وہ کاشی ہے لکھنؤ اب صوبہ جات متحدہ کا حقیقی دارالحکومت ہے اور تمام اعیان وارکان حکومت اور انکے دفاتر لکھنؤ ہی میں ہیں۔ اس اعتبار سے الہ آباد کی تائید میں حکومت کی سرپرستی کا استدلال بھی کوئی قوت نہیں رکھتا۔ الہ آباد میں اکاڈمی کا مرکز ہونے سے اردو کے ارباب ادب کو اس سے مغایرت سی ہو گئی ہے جسکا نقصان یہ پہونچ رہا ہے کہ ہم ایسے اشخاص کی جنکی ہمکو سخت ضرورت ہے معاونت نہیں حاصل کر سکتے۔ ہندی کے اغراض کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے بہ نسبت الہ آباد کے لکھنؤ ہی میں زیادہ سہولتیں ہیں۔

اکاڈمی ہر سال اپنا ایک سالانہ اجلاس الہ آباد ہی میں منعقد کرتی ہے اور اسکے عام جلسے بھی الہ آباد میں ہوتے ہیں۔ یہ اور غضب ہے۔ کاش یہی کیا جاوے کہ اسکا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد کیا جائے ہماری رائے میں اردو ہندی کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسکے دو سالانہ اجلاس ہونا چاہییں ایک لکھنؤ میں اور دوسرا کاشی یا بنارس میں۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ اکاڈمی کی بہبودی چاہنے والے ہمارے اس مطالبہ؛ اگر مطالبہ نہیں تو مشورہ پر ضرور غور کر کے جلد سے جلد اکاڈمی کے مرکزی دفتر کو الہ آباد سے لکھنؤ منتقل کرنے کا فیصلہ کرینگے۔

اُردو ٹائپ

اُردو ٹائپ کی نشر و ترویج کا سہرا حکومت آصفیہ کے سر ہے۔ اور جو کچھ بھی گرانقدر جدوجہد اب تک کی گئی ہے اسمیں ہز اکزالٹڈ ہائینس کی گورنمنٹ پیش پیش ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ موجودہ اُردو ٹائپ میں چھپی ہوئی جو کتابیں آئے دن مملکت نظام اور ہمارے سرکاری و غیر سرکاری مطابع سے نکلتی رہتی ہیں وہ اطمینان بخش نہیں ہیں۔ اُردو حروف کی تمام مختلف شکلوں کو جو ہاتھ کی لکھائی میں نظر آتی ہیں ٹائپ میں نقل کرنا آجتک یک سعی لاحاصل ہے قلمی تحریر کی خوبیوں کا انحصار مختلف امور پر ہے مثلاً حروف کے دائروں اور قوسوں کی شکل اور قد میں حسب موقع تنوع پیدا کرنا۔ ایک خاص حرف کی شکل اسکے کسی لفظ کی ابتدا، وسط یا آخر میں آنے پر حسب حالت بدل دینا، طباعت کا حسن یہ ہے کہ حروف کی شکل اور قد یکساں ہوں۔ سطریں اقلیدسی صحت کے ساتھ برابر برابر ہوں [illegible] میں بآسانی پڑھ لیا جاسکے۔

بدقسمتی سے ہمارے دماغ ابتدا سے ٹائپ کے متعلق زہر آلود ہو چکے ہیں اور ہم ٹائپ کے نام پر اسپنے دل میں ایک تنفر کا جذبہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسکا سبب یہ ہے کہ ہم حسن و جمال کے دلدادہ ہیں اور ہر کام کے مفید و غیر مفید ہونے کا اندازہ اُسکے کم خرچ بالانشیں ہونے سے کرتے ہیں۔ ٹائپ میں نہ حسن و جمال ہے نہ وہ لیتھو سے کم خرچ۔ ایسی حالت میں اُسکا مستقبل بہت تیرہ و تار ہے اور موجودہ حالات میں اسکے مقبول ہونے کے بہت کم توقعات ہیں۔

صرف ایک صورت ممکن نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جیسا کہ علامہ عبداللہ یوسف علی کی رائے ہے پہلے ایک سستے اور اچھے ٹائپ کی ترویج کی جائے۔ پھر جسقدر زمانہ گذرتا جائیگا اسمیں اصلاحات ہوتی جائیں گی اور رفتہ رفتہ ٹائپ کے حروف میں حسن و جمال بھی پیدا ہوجائیگا۔ اور معیار بلند ہوجائے گا ٹائپ کی فوقیت کا راز طباعت کی صفائی اور صحت میں مضمر ہے۔ طباعت کی صفائی اور صحت ہی وہ خصوصیات ہیں جو ہم کو ٹائپ کا گرویدہ بنانے پر مجبور کر رہی ہیں اور اگر ذرا بھی توجہ اسپر کی گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ لیتھو نظروں سے نہ گر جائے۔ اور ٹائپ ہندوستان کے طول و عرض میں کامران ہوجائے۔

مزار انیس

تقریباً دس سال سے میر انیس کے مزار کی مرمت اصلاح کی تحریک مقامی صحائف کے صفحات پر اپنی سرگرمی دکھاتی رہی ہے لیکن کوئی عملی اقدام کبھی نہیں ہوا۔

میر ببر علی انیس مغفور نے ۱۲۹۱ھ میں انتقال کیا اور اپنے موروثی قبرستان واقع سبزی منڈی لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔ اس قبرستان میں ایک چھوٹی سی عمارت موجود ہے لیکن وہ اسقدر بوسیدہ ہے کہ اسکے قائم رہنے کی کوئی توقع نہیں۔ ہمکو یہ معلوم کرکے بہت مسرت ہوئی کہ اسکی اصلاح تعمیر کے لیے ایک منتظم مجلس قائم ہوگئی ہے جو متدین اور دلسوزی سے کام کرنے والوں پر مشتمل ہے اُس نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ سرمایہ چندہ سے فراہم کیا جا رہا ہے۔ ارباب ہمم کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان و ادب کی یادگار کی بقا کے لیے اپنی فیاضی کا ثبوت دیں۔

لخت جگر کی ترتیب

لسان القوم حضرت صفی کی ذات پر لکھنؤ جسقدر بھی فخر کرے کم ہے۔ شیعہ فرقہ کی بیداری اصلاح کے لیے جو کچھ مولانا نے اپنی سحر بیانی سے کیا ہے وہ کوئی دوسرا عملی خدمات سے نہیں کرسکا ہے۔ مولانا نے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی سرگرمیوں میں ابتدا سے نمایاں حصہ لیا اور ان احسانات کے جذبہ تشکر میں "لسان القوم" کا خطاب پایا۔ آپنے ایک مسلسل نظم لخت جگر کے عنوان سے کانفرنس کے ہر اجلاس میں پڑھی جسمیں فرقہ مذکور کے شاندار ماضی۔ موجودہ تنزل اور اسکے اسباب اور بحالی بہتری کی تدابیر پر مصلحانہ بحث کی ہے اور جن مقامات پر کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں انکے تاریخی حالات مشاہیر ادبا و فضلا کا تذکرہ فرمایا ہے۔ مثلاً امروہا میں اگر نظم پڑھی ہے تو مصحفی کی یاد کو تازہ کر دیا ہے۔ بنارس پہونچے ہیں تو صبح بنارس کے زاہد فریب مناظر کی مصوری کرتے ہوئے شیخ علی حزیں کا ذکر کیا ہے۔ اسیطرح جونپور کی تاریخ اسکے اولوالعزم بانی شہزادہ جونا بعدۂ محمد بن تغلق کے کارناموں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دہلی اور پٹنہ کے جسکا قدیم تاریخی نام "پٹالیپتر" ہے اور جو راجہ دکرما جیت اور راشوک اعظم کا دارالحکومت تھا، گذشتہ جاہ و جلال عظمت و شوکت پر اشک حسرت بہائے ہیں۔ مسرت ہے کہ فنون کتابت و خوشنویسی کے مبصر و نقاد شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری لخت جگر کی تقریباً پچیس نظموں کے مجموعہ کو مولانا کی ادبی زندگی۔ انکے

قومی کلام کے خصوصیات اور انکی شاعرانہ عظمت کے اسباب نیز ان نظموں کے متعلق جا بجا مختصر تشریحات وحواشی کے ساتھ ترتیب دے رہے ہیں ابتک تو "لخت جگر" صرف ایک فرقہ کی ملک تھی لیکن مجوزہ صورت میں شایع ہونے کے بعد وہ اردو کا مشترکہ ورثہ ہوگی اور مولانا کے نام کو اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ تاباں رکھیگی۔

خطوط غالب[۱]

ہندو یونیورسٹی بنارس کے ادیب اور ادب فارسی کے پروفیسر مہیش پرشاد صاحب جنھوں نے ریسرچ کے سلسلہ میں حال میں فارس کی سیاحت کی تھی غالب کے اُن خطوط کو جو عود ہندی، اردو معلی، اور وقتاً فوقتاً ادبی رسائل میں شایع ہوے ہیں تاریخی تسلسل کے ساتھ ترتیب دے رہے ہیں۔ آپ نے کچھ غیر مطبوعہ مواد بھی حاصل کیا ہے اور ہر مکتوب الیہ کے مختصر سوانح حیات اور اسکے علمی شغف پر تبصرہ بھی فرمایا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ خفتگان خاک جو غالب کے مکتوب الیہم ہونے کے سبب سے گمنامی کی موت کے بعد دنیائے ادب میں زندہ ہو جائینگے۔ ممکن ہے کہ انہیں سے مشاہیر کی علمی زندگی لکھنے کا شوق بھی کسی کو پیدا ہو جائے اور اُنکے ادبی کارنامے بھی منظر عام پر آجاویں۔ یہ ایک گرانقدر خدمت ہے جس پر پروفیسر مہیش پرشاد قابل ہزار آفریں ہیں۔

اُردو کی مقبولیت

جو لوگ اُردو کے ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان بننے کے استحقاق سے منکر ہیں وہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اسوقت ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں اُردو کے رسائل واخبارات کی داغ بیل نہ پھیلی ہو۔ اور بنگلور (میسور) کے مشاعرہ میں جو غزلیں پڑھی جاتی ہیں انکی داد تحسین کی گونج سری نگر (کشمیر) میں سُنائی دیتی ہے۔ براعظم ہند کے چپہ چپہ میں اُردو بولی جاتی ہے۔ آسام کا کوئی قریہ ہو، ساحل شرق کا کوئی بندرگاہ ہو، صوبہ جات سرحد شمالی ومغربی کا کوئی درہ ہو یا بلوچستان کا کوئی اُجاڑ مقام صرف اردو ہی ایک عام

---

[۱] غالب کے قلم کے لکھے ہوے بعض غیر مطبوعہ خطوط اب بھی جا بجا موجود ہیں۔ لکھنؤ میں غالب کے دو دستی خط نواب ذکی علی خان صاحب [illegible] کے پاس موجود ہیں۔ ہم کوشش کرینگے کہ کسی آیندہ اشاعت میں خطوط کے عکس کو "خیابان" میں شائع کریں۔

فہم زبان ہے جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ کچھ ہندوستان ہی پر منحصر نہیں خلیج فارس اور بحیرہ عرب کے سواحل اردو سے اسیطرح آشنا ہیں جسطرح جنوبی ہندوستان کا کوئی گاؤں۔ عراق۔ حجاز عدن۔ مشرقی افریقہ جہاں جہاں ہندوستانی پہونچے ہیں اپنی محبوب زبان کو ساتھ لیگئے ہیں۔ اسکی سادگی، لوچ، ہلکا پن یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ ہر سرزمین پر اسکو ہر دلعزیز بنا دیتی ہیں۔ اور اگر اسی طرح اسکے پینگ بڑھتے رہے تو شاید ہم کہہ سکیں کہ مشرق قریب کے ممالک میں بھی اردو غیر مانوس نہ رہیگی۔

خیابان کی بزم تحقیق

ہم کو اعتراف ہے کہ ہم نے خیابان کے لیے قلمی اعانت حاصل کرنے میں خود بخل کیا ہے اور صرف اُن مشاہیر و مستند ارباب قلم کی خدمت میں استدعا کی جرأت کی ہے جو ملک، قوم زبان و ادب کے مایۂ افتخار ہیں۔ ایک اردو رسالہ کی ضخامت پری بہت آسان ہے لیکن ناموافق مزاج غذ لے مضامین سے جو جراثیم پیدا ہو سکتے ہیں اُن سے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہماری ادبی فضا کو مسموم نہ بنا دیں۔ ہم اُن حضرات کے یقیناً رہین منت ہیں جنھوں نے ملک کے لیے ایک ماہانہ اُردو ریسرچ (محققانہ) رسالہ کی ضرورت کا احساس کر کے اسکو کامیاب بنانے میں ہماری حوصلہ افزائی کی ہم کو کامل وثوق ہے کہ انکی دلچسپی خیابان سے ہمیشہ برقرار رہیگی۔

حضرت جلال مرحوم کے پانچویں غیر مطبوعہ دیوان سے

پیدائش ۱۲۴۴ھ * ۱۳۲۷ھ وفات

حکیم میر ضامن علی جلال لکھنؤ کے آخری دور کے شاعر تھے۔ آپ ۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے۔ اور لکھنؤ ہی میں آپ کی تربیت ہوئی۔ آپ کا آبائی پیشہ طبابت تھا اور آپ کے والد حکیم میر اصغر علی دور شاہی کے حاذق اطبا میں شمار ہوتے تھے۔ جلال کی تعلیم تو بہت زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مشہور ہے کہ ریاست رامپور کے کتب خانہ میں کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو انکی نظر سے نہ گزری ہو۔ پڑھتے پڑھتے آخر عمر میں آنکھوں میں ناسور پڑ گئے تھے۔ طب کا اکتساب باپ سے کیا مگر طبابت کو کبھی اپنا پیشہ نہیں قرار دیا۔ شاعری میں جلال کو پہلے امیر علی خاں ہلال سے تلمذ ہوا اسی وجہ سے ہم وزن و ہم قافیہ تخلص جلال اختیار کیا۔ چند ہی روز میں ہلال اپنے ہونہار شاگرد کے کلام کی اصلاح سے عاجز ہو گئے اور آخرکار شاگرد کو اپنے استاد میر علی اوسط رشک کے سپرد کر دیا۔ رشک اسوقت اپنے فضل و کمال میں "ناسخ دوراں" خیال کیے جاتے تھے۔ رشک کی شاگردی نے جلال کی عنانِ خیال مشق شعر سے تحصیل فن اور تحقیق مسائل کی طرف پھیر دی۔ آخر میں جلال کو نواب فتح الدولہ برق سے تلمذ حاصل ہو گیا تھا۔

جلال کے والد میر اصغر علی طبیب ہونے کے علاوہ شہرہ آفاق داستان گو بھی تھے منشی احمد حسین قمر مصنف "طلسم ہوشربا" میر اصغر علی کے شاگرد تھے۔ اور اسی سلسلہ میں لکھنؤ کے اجڑنے کے بعد نواب یوسف علی خان والیِ رامپور کے دربار میں پہونچ گئے تھے جلال اپنے والد کی حیات ہی میں رامپور بلائے گئے تھے۔ قدردان ملجانے کے بعد جلال کو فکر معیشت سے اطمینان ہو گیا اور انکو اپنے فن کی تکمیل کا کافی موقع مل گیا۔ نواب یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں کا دور آیا جنھوں نے اہل کمال کی اسقدر

قدردانی کی کہ رامپور سلطان محمود غزنوی کا دربار ہو گیا۔ منشی مظفر علی خاں اسیر تو استاد غالب ہی تھے مفتی سعد اللہ شارح معیار الاشعار، آفتاب الدولہ قلق امداد علی بحر اور نواب احمد حسن خاں عروج سب ہی رفتہ رفتہ سمٹ کر آ گئے۔ مرزا غالب بھی دربار کے نمک خوار تھے اور کبھی کبھی آ جایا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے :-

ایک دفعہ جلال مرزا نوشہ سے ملنے گئے، مرزا شغل شراب میں تھے۔ جلال کے سامنے بھی ایک جام پیش کیا۔ جلال نے کہا میں نہیں پیتا۔ مرزا نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولے "بھئی آج تو ابر ہے" جلال نے پھر انکار کیا۔ مرزا نے اصرار کیا اور کہا "ارے ابر بھی ہے اور خنکی بھی"۔ جلال کو جلال آ گیا۔ کہا "میں حرام جانتا ہوں" مرزا مسکرائے اور کہا "پھر تم نے یہ شعر کیوں کہا" ؎

رات سے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

سنہ ۱۳۰۲ھ میں رامپور سے سلسلہ ملازمت منقطع ہونے کے بعد جلال ریاست منگرول میں پہنچ گئے تھے، مگر نواب حامد علی خاں بہادر کے عہد میں دوبارہ اپنی خدمت پر مامور ہو گئے تھے اور مرتے دم تک وظیفہ پاتے رہے۔ رامپور میں داغ کے ہوا خواہوں سے جلال کی شاعرانہ نوک جھونک ضرب المثل تھی۔

جلال نے متعدد تصانیف اور چار دیوان مطبوعہ چھوڑے۔ تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے :-

۱۔ دیوان اول : شاہد شوخ طبع۔ سنہ ۱۲۹۷ھ میں مرتب اور سنہ ۱۳۰۰ھ میں چھپا۔
۲۔ دیوان دوئم : کرشمہ گاہ سخن۔ سنہ ۱۳۰۱ھ میں مرتب ہوا سنہ ۱۳۰۲ھ میں چھپا۔
۳۔ دیوان سوئم : مضمون ہائے دلکش۔ سنہ ۱۳۱۶ھ میں طبع ہوا۔
۴۔ دیوان چہارم : نظم نگاریں۔ سنہ ۱۳۲۱ھ میں طبع ہوا۔

۵۔ افادہ تاریخ: فن تاریخ گوئی پر ایک رسالہ۔ ۱۳۰۳ھ میں شایع ہوا۔

۶۔ منتخب القواعد: خواص حروف کے بیان میں۔ ۱۳۰۲ھ میں شایع ہوا۔

۷۔ تحفۂ سخنوراں یا سرمایۂ اردو: اردو کا لغت۔ ۱۳۰۴ھ میں شایع ہوا۔

۸۔ مفید الشعرا: تذکیر و تانیث کے بیان میں۔ ۱۳۱۱ھ میں شایع ہوا۔

۹۔ تنقیح اللغات: صحت لغات میں۔ مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوتا حضرت آرزو کے پاس قلمی نسخہ موجود ہے۔

۱۰۔ گلشن فیض: فارسی زبان میں اردو لغت۔ مطبوعہ نولکشور پریس۔ اب کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔ مذکورہ بالا کتب کے علاوہ رسالہ عروض و قوافی اور پانچواں دیوان جو انکے خویش سید محمد نظیر صاحب مقال کے پاس موجود ہیں غیر مطبوعہ ہیں۔

جلال نے ۱۳۲۶ھ میں انتقال کیا اور کربلائے تالکٹورہ میں مدفون ہوئے قبر ہنوز موجود ہے۔ سنہ وفات ذیل کے مصرع سے نکلتا ہے[1]:—

میر ضامن علی جلال آہ آہ!

جلال کے فرزند اصغر کمال بھی صاحب کمال تھے انھوں نے بھی ۱۳۲۹ھ میں انتقال کیا۔

ذیل کا کلام محولۂ بالا پانچویں[2] دیوان غیر مطبوعہ میں منتخب کیا گیا ہے ہم حضرت آرزو اور جناب مقال کے منت کش ہیں کہ اول الذکر بزرگ نے حالات قلمبند کرنے میں اعانت فرمائی اور آخر الذکر نے غیر مطبوعہ دیوان سے انتخاب کرکے شایع کرنے کی اجازت دی۔

---

[1] حضرت جلال کے مرقومہ الہامات انکے ارشد تلامذہ و جانشین حضرت آرزو کے مضمون بعنوان حالات جلال کی مدد سے جو ہندوستانی اکاڈیمی صوبہ جات متحدہ کے سہ ماہی رسالہ میں شایع ہوا ہے لکھے گئے ہیں اور تصدیق خود حضرت آرزو نے اور جلال مرحوم کے خویش جناب مقال سے کیگئی ہے۔

[2] اس دیوان کا نام "یادگار جلال" ہے اور ۱۸×۲۲ کی تقطیع کے تقریباً تین جز پر مشتمل ہے۔

بحیثیت شاعر، لکھنؤ کے دورِ آخر کے اس باکمال شاعر اور محقق کا رتبہ کیا تھا اسکا محاکمہ اربابِ نظر ذیل کے انتخابات سے خود کر سکیں گے !

ہم کو اعتراف ہے کہ ہم صرف ایک سرسری نظر میں انتخاب کر سکے ہیں، جلالؔ کی شاعرانہ زندگی کے آخری عہد کا کلام پُرسکون مطالعہ چاہتا ہے تاہم ہم نے جو کچھ ان صفحات میں پیش کیا ہے وہ انکو مسلم الثبوت باکمال شاعر تسلیم کرانے کے لیے کافی ہے۔

(مدیر مرتب)

احتیاجِ نامۂ و پیغام اے قاصد نہیں　　بے طلب آتا ہے جذبِ دل کا بُلوایا ہوا

ہوش میں آ اِک ادا سے یہ جو کہہ بیٹھے ہو تم　　اور بیخود ہے تمارا ہوش میں لایا ہوا

اُلٹی رسمیں پائیں ملکِ عشق کی ہم نے جلالؔ　　لوگ کہتے ہیں گئے دل کو یہاں آیا ہوا

(٭)

مری نگاہ ہوئی شوقِ دید کی رہبر　　کلیم کو ارنی گوئے طور میں نے کیا

بَری تمام گناہوں سے اپنے تھا میں جلالؔ　　جب ایک نعرۂ ربِّ غفور میں نے کیا

٭

کیا راز و نیاز اُس سے ہیں یہ پوچھ نہ لے دل　　تجھ سے بھی میں اُلفت کے نہ اسرار کہونگا

لبوں پر دم آیا ہوا ہے کسی کا　　کوئی دم میں اب فیصلا ہے کسی کا

اُٹھائے نگہ حوصلہ ہے کسی کا　　نقاب اُٹھتی ہے سامنا ہے کسی کا

جو ٹھکرائیگا سخت پچھتائے گا تو　　ارے دل یہ حسرت بھرا ہے کسی کا

ہمیں چشمِ دل ڈھونڈ دیتے دیکھتے ہیں　　زمانے میں کون آشنا ہے کسی کا

جلالؔ آنکھ کہتی ہے ہشیار رہنا　　نقاب اُٹھتی ہے سامنا ہے کسی کا

(٭)

دل کی ناکامیوں نے کام کیا — کہ مرا کام ہی تمام کیا
ہم نے تنہا گذار دی شبِ غم — بیکسی خوب اہتمام کیا

اُٹھ گئی تھیں کہیں اُس شوخ کی نیچی نظریں — دیر تک ہم نے دو عالم تہ و بالا دیکھا
ہم نہ کہتے تھے کہ تم اسکو نہ دینا تسکیں — اور دل کو تپشِ دل نے اُچھالا دیکھا

دل کو کب تک دردِ دل تڑپائے گا — صبر ہی انجامِ کار آجائے گا
ہوش رفتہ دیکھیے جب آئے گا — تیرے بیخود کو کدھر لیجائے گا
ہم پڑے ہیں راہ میں جس کی فلک — راہ پر کب تک اُسے تو لائے گا

دیکھ خود جلوہ ذرا اپنی خود آرائی کا — آئینہ سامنے ہے چشمِ تماشائی کا

ہر موئے تن ہے میرا پیاسا مرے لہو کا — چلتا ہے خود گلے پر خنجر رگِ گلو کا

جسکو آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں جستجو سے مل گیا — کچھ پتا بزمِ بتانِ خوبرو سے مل گیا

رشک کہتا ہے نہ چل شوق کا اصرار کہ چل — جائیں کیونکر کہیں ہم اور نہ جائیں کیونکر

کبھی اے جذبِ دل لے آ اُسے گورِ غریباں پر — کہ دامن اُسکا اپنی خاک پر ہو خاک داماں پر

اک اُف کبھی جو آ گئی اپنی زبان پر — ساتوں طبق زمین کے تھے آسمان پر

مہرباں بھول کے کیوں آج ہوئے ہو ہم پر
یاد آیا ہے مگر تم کو ستم اور کوئی

اٹھ چلا عاشقِ غم دوست تو اب دنیا سے
ڈھونڈھ لے اپنا ٹھکانا ترا غم اور کوئی

جذبِ دلِ مضطر کی تاثیر نظر آئی
پہلو میں مرے اُسکی تصویر نظر آئی

گھر تک مرے آ آ کر پھر پھر گئے وہ اکثر
اُلٹی کشش دل کی تاثیر نظر آئی

یا آہِ رسا میری پنہاں مرے دل میں تھی
یا عرش الٰہی کی زنجیر نظر آئی

سمجھے تھے کہ فرقت میں مر جائینگے ہم جلدی
اسمیں تو قیامت کی تاخیر نظر آئی

حیرت جو مری دیکھی حیران سے ہیں وہ بھی
تصویر کے پہلو میں تصویر نظر آئی

یا پھانس مرے دل کی معلوم نہ ہوتی تھی
یا بڑھ گئی کچھ ایسی جو تیر نظر آئی

الفت میں تری دیکھا غیر اپنوں کو ہو جاتے
حالت ہمیں خود اپنی تغئیر نظر آئی

وہ ترچھی نگاہوں سے محفل میں ادھر دیکھیں
سیدھی ہمیں کچھ اپنی تقدیر نظر آئی

تقدیر کو ہم اپنی کرتے جو جلالؔ اپنا
ایسی نہ کوئی ہمکو تدبیر نظر آئی

مریضِ عشق میں مرتے ہیں بے موت
اجل کیسی شفا کیا جانے کیا ہے؟

فقیرِ عشق جو کہتے ہیں سُن لے
اسے اُنکی دعا کیا جانے کیا ہے؟

گذرتی ہے محبت میں جو ہم پر
وہ حالت دوسرا کیا جانے کیا ہے؟

کیا ہے گم جہاں وارفتگی نے
جلالؔ اُسکا پتا کیا جانے کیا ہے؟

یہ کچھ ابتدا ہی میں جور آپ کے
عنایت کی بھی انتہا ہو گئی

تم لگا دو آکے ٹھوکر ناز سے
کون اُٹھے حشر کی آواز سے

دل لیا ہے جس نگاہِ ناز سے — دیکھ لینا پھر اُسی انداز سے
کیوں نہ بانگِ لن ترانی پر ہو غش — کچھ نہ ملتی ہے تری آواز سے
اُڑ گئی تو کیوں نہ بال و پر کے ساتھ — شکوہ ہے یہ حسرتِ پرواز سے

خود پکار اُٹھا جو دل میں راز ہے — تو بھی خاموشی بڑی غماز ہے
جو نگہ ہے اُسکی تیر انداز ہے — ہر اشارہ تیرِ بے آواز ہے
حسرتِ دیدار کی محرم ہے آنکھ — دل ہے اور اُلفت کا اُسکی راز ہے
کیوں نہ لوٹوں لوٹنے کی ہے جگہ — ناز کا بسمل ہوں اسیرِ ناز ہے
قہر ہے ہم سے عدو کا پوچھنا — کیا مزاجِ دشمناں ناساز ہے
غمزہ کو دلبر بتاتی ہے ادا — غمزہ کہتا ہے نگاہِ ناز ہے
منتظر اب تک کسی کا ہے جلال — قبر میں بھی چشمِ حسرت باز ہے

جا کے کس کا ہمنشیں ہمدرد میرا ہو گیا — جس میں درد اُٹھتا تھا رہ رہ کے وہ دل کیا ہو گیا

جوشِ اشکِ چشم دریا بار ہے — ڈوب مرنے دل تو بیڑا پار ہے
کس مزے کی فرطِ لکنت ہے کلیم — [illegible]
امتحاں پھوٹے مقدر کا ہے آج — سر مرا اور آستانِ یار ہے

مہرباں کو دے کے دل نامہرباں دیکھا کیے — جو دکھایا تو نے ہم نے آسماں دیکھا کیے
نیم خواب آنکھوں سے اپنی رات بھر وہ شوق میں — میری چشمِ شوق کی جانبازیاں دیکھا کیے
کس کی آمد تھی کہ تو آتی تھی لب پہ بار بار — بیقراری تیری جانِ ناتواں دیکھا کیے

اللہ رے عاشق کی ز خود رفتگی شوق — یوں ہے تری محفل میں کہ محفل میں نہیں ہے
گم کردہ رہ شوق کا جو راہنما ہو — ایسا کوئی جادہ مری منزل میں نہیں ہے

محبت کے ہیں جو ناشاد اُن سے دلگی کیسی؟ — یہ لے زخم جگر دل کے تڑپنے پر ہنسی کیسی ؟
فراق یار میں دیتی ہے کیا کیا ساتھ تنہائی؟ — ادا شرطِ محبت کر رہی ہے بیکسی کیسی؟
تمنا ہے کہ کوئی زخم ہی اپنا ذرا ہنس دے — ہوئی ہے اے فلک معدوم دنیا سے خوشی کیسی؟

محشرستان

ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار حضرت محشر عابدی بی۔اے کے منتخب افسانوں کا مجموعہ شایع ہو گیا، اسمیں بارہ نادر دلچسپ، سبق آموز اور نصیحت آمیز افسانے درج ہیں سرورق جاذب نظر اور کتابت و طباعت بصیرت افروز ہی، مشہور اہل قلم مثلاً حضرت جوش ملیح آبادی حضرت ثاقب کانپوری اور علی اختر صاحب کا متفقہ فیصلہ ہی کہ محشرستان بہترین افسانوں کا مجموعہ ہی ۱۲ × ۸ کے سائز ضخامت تقریباً ۲۵۰ صفحات قیمت غیر مجلد عہ مجلد عار علاوہ محصولڈاک

مِلنے کا پتہ:۔ مکتبہ عہد آفرین روبرو دفتر مالگذاری، حیدرآباد (دکن)

دی مسلم ریویو لکھنؤ

حقائق کا آئینہ، علمی تحقیقات کا خزینہ۔ جس کا مقصد تبلیغ اسلام اور رسول عربی کی تعلیم کا نشر اور اسلام پر مسیحیت کے ناروا و بے بنیاد اعتراضات کی تردید۔ ہر ماہ انگریزی زبان میں لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ مسیحی دنیا میں نو مسلمین کو مفت بھیجا جاتا ہی کتب خانوں کو صرف ۸ پیشگی دینے پر۔ عام چندہ سالانہ ۵ غیر مستطیع طلبا سے ہے علمی مضامین کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہی۔

مِلنے کا پتہ:۔ منیجر دی مسلم ریویو لکھنؤ

کناڈا کی تاریخ سے سبق

(بقلم پنڈت منوہر لال صاحب زتشی، ایم۔ اے، آئی۔ سی۔ ایس، (ریٹائرڈ))

(۱)

"ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ صرف اس وجہ سے کہ برطانیہ کی دوسری
نوآبادیات خود مختار حکومت حاصل کر چکی ہیں اُسی قدر نازیبا ہے، جس قدر کہ کناڈا کا سمورین
کوٹ ہندوستان کی گرم آب و ہوا میں پہننا"

یہ لارڈ مارلے؎ کے الفاظ ہیں جو موصوف نے کسی موقع پر ہندوستانی سیاسیات پر تقریر کرتے ہوئے کہے تھے۔ لارڈ مارلے کے یہ الفاظ ایک سیاسی کہاوت ہو گئے ہیں۔ لیکن اسکے یہ معنے نہیں کہ ہم اس کہاوت کو ایک حکیمانہ قول متصور کر کے تسلیم کر لیں۔ سائبریا میں کناڈا کا سمورین کوٹ مفید ترین لباس ثابت ہوگا لیکن یہ کہنا کہ سائبریا کو حکومت خود اختیاری دی جائے ایک بہت بڑی جسارت ہوگا۔ اسٹریلیا کو "سلف گورنمنٹ" حاصل ہے لیکن وہاں کوئی سمورین کوٹ نہیں پہنتا۔ اسمیں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ ہندوستانیوں اور اہل کناڈا میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اختلافات کو نظر انداز کرنا سراسر جہالت ہے۔ لیکن ان اختلافات سے ہم کو اس نتیجہ پر ہرگز نہ پہونچنا چاہیے کہ ہم اہل کناڈا کے حالات سے بے خبر اور کناڈا کی سیاسی فضا کے مطالعہ سے قاصر رہیں اور کناڈا کے ان اداروں سے جو درحقیقت ہمارے مفید مطلب ہو سکتے ہیں کوئی استفادہ نہ کریں۔ ایسے اختلافات تو ہر زمانہ اور ہر دور میں ممالک عالم میں موجود تھے اور رہینگے۔ اگر لارڈ مارلے کے الفاظ سے استدلال کیا جاوے اور صغرے و کبرے سے قضیہ بنا کر منطقی نتیجہ نکالا جائے تو ازمنۂ قدیم کی تاریخ کا مطالعہ عملی اغراض سے بے سود ہو جاویگا۔ تاریخ سیاسیات کی تعلیم افتادہ ونفا ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک ملک اور ایک عہد کے واقعات سے سبق لینا اور انہیں تطبیق دوسرے

؎ Lord Marley

ملک اور دوسرے عہد سے کردو، یا دو قوموں اور دو ملکوں کی مشابہتوں اور اختلافات کا تجزیہ کرو اور اُن سے نتیجہ خود نکال لو۔

ہندوستان اور کناڈا دونوں ممالک میں انگریز بطور فاتحین کے آئے تھے۔ لیکن وہ کناڈا میں مفتوح اقوام کو اپنے میں مدغم کرنے سے قاصر رہے جس کا اثر یہ ہوا کہ فرانسیسی کناڈا اپنے معاشرتی اور فرقہ وارانہ اقتدار و شخصیت کے احیاء میں کامیاب ہو گیا۔ اہل کناڈا فرانسیسی امارت دیکھے ہوئے تھے لہٰذا انہوں نے برطانوی گورنروں کے سامنے سر تسلیم تو خم کر دیا لیکن عارضی طور سے اور جوں ہی کہ انہیں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی اضطراب کی تخم ریزی شروع ہو گئی۔ انگریزی دفتری حکومت کا انکو مراعات سے محروم رکھنا، غضب ہو گیا، اور ایک باضابطہ جنگ چھڑ گئی، جس میں ریفارم پارٹی کی انتہا پسند ٹکڑی نے آئین نواز جماعت سے علیحدہ ہو کر مجنونانہ افعال شروع کر دیے جس سے ملک میں غدر ہو گیا اور طوائف الملوکی کی شان پیدا ہو گئی۔ ہنگامہ تو فرو کر دیا گیا۔ امن بھی قائم ہو گیا۔ کناڈا کو قلمرو ی برطانیہ عظمٰے سے علیحدہ کرنے کی کوشش بھی ناکام رہی لیکن آئین نواز جماعت کی بات بن گئی۔ اور جنگ آزادی کناڈا کو حکومت خود اختیاری دلا کر ختم ہو کر رہی۔ یہی وہ نظام اساسی تھا جو تمام برطانوی نو آبادیات کے کانسی ٹیوشنوں کے لیے نمونہ بنا اور خدا کرے کہ وہ وقت بھی آئے کہ یہ ہمارے ملک کے نظام اساسی کا بھی نمونہ بن سکے۔ اس اعتبار سے کناڈا کی تاریخ کا مطالعہ بہت دلبستگی رکھتا ہے اور سبق آموز بھی ہے۔

ابتدائی تاریخ

جنوبی کناڈا کی بنیاد سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں پڑی تھی۔ اس کے بعد یہ شمالی امریکہ کی فرانسیسی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ فرانسیسی مقبوضات کی وسعت راس برٹن[2] سے کوہ راکی[1] کے سلسلہ تک اور بڑی جھیلوں[4] کے دامن سے خلیج[3] میکسکو تک تھی۔ لیکن فرانس کو کبھی نو آبادیات سے دلچسپی نہ تھی جنوبی کناڈا کے باشندے شمالی فرانس کے ان آٹھ ہزار کسانوں کی

[1] Rockey mountains [2] Cape Briton [3] Gulf of mexico [4] Great Lakes

نسل سے تھے جنکو لوئی چاردہم[۱] کے شہرہ آفاق وزیر کالبرٹ[۲] نے لاکر یہاں آباد کیا تھا۔ سنہ ۱۷۶۰ء میں اس پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا اور آخرکار سنہ ۱۷۶۳ء میں جب معاہدہ پیرس کی تکمیل ہوئی تو انگریزوں کو دے دیا گیا اور معاہدہ مذکور میں یہ شرط کر دی گئی کہ برطانیہ عظمٰے اپنے قوانین کے حدود میں اہل کناڈا کو مذہبی آزادی دے گا۔ اس عہد کو انگریز ہمیشہ نباہتے رہے ہے۔ معاہدہ کے آٹھ ماہ بعد جارج ثالث نے شمالی امریکہ میں اپنی عارضی حکومت کے لیے فرمان جاری کیا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ جس وقت بھی جنوبی امریکہ اور صوبہ کیوبک کے حالات اجازت دیں گورنر جنرل ارکان کونسل کے مشورہ سے اور اُن طریقوں اور عنوانات سے جو امریکہ کی نوآبادیات کے لیے مناسب تھے ایک عام مجلس طلب کرے گا۔ اس کے علاوہ گورنر مجاز تھا کہ وہ کونسل کے مشورہ سے ایسے قوانین وضع کرے جو قوانین انگلستان سے مشابہ اور ہمساز ہوں۔ جو شخص مجلس واضع قوانین کا رکن منتخب کیا جاتا اسکو حلف وفاداری لینا پڑتا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجلس کبھی بھی عرصہ شہود میں نہیں آئی۔ کناڈا کی آبادی جو ۷۰ ہزار فرانسیسوں اور زیادہ سے زیادہ ۳۰۰ انگریزوں پر مشتمل تھی حکومت خود اختیاری کے آغاز میں مجلس کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اور اسکی غرض صرف یہ تھی کہ اسکی زبان۔ قانون اور مذہب کی حرمت برقرار رہے۔ علاوہ بریں "حلف وفاداری" میں جو شرائط رکھی گئی تھیں اُن سے فرانسیسی حق رائے دہندگی سے بالکل محروم ہو گئے تھے۔ لیکن اس امر کی ضرور کامل آزادی تھی کہ وہ اپنی زبان بولیں اور اپنا پیارا مذہب سینہ سے لگائے رہیں۔ بس یہ ان کے سکون قلب کیلیے بالکل کافی تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد اضطراب رونما ہونے لگا۔ جس کا راز غالباً یہ تھا کہ انگریز جج فرانسیسی قانون سے نابلد ہونے کی وجہ سے کماحقہ انصاف نہ کر سکتے تھے۔ سنہ ۱۷۷۴ء میں جب پُرانی نوآبادیوں میں بےچینی خوفناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ یہ مناسب خیال کیا گیا کہ کناڈا کو اس کا قدیم نظام اساسی دے دیا جائے۔ اور کیوبک ایکٹ[۳] کا منشا بھی یہ تھا کہ کناڈا کے رومن کیتھلک باشندوں کو کامل مذہبی آزادی حاصل ہو جائے اور پادریوں کو ان کے حقوق ملجاویں۔ بہرکیف سنہ ۱۷۶۳ء میں جو ایک نمائندہ مجلس کے

---

[۱] Louis XIV [۲] Colbert
[۳] Cubec Act

قیام کے متعلق اعلان کیا گیا تھا۔ اس کا نفاذ کبھی بھی نہیں ہو سکا۔ وجہ یہ تھی کہ اولاً چند انگریزوں میں سے مجلس کے ارکان منتخب کرنا ناممکن تھا دیم کناڈا کے کیتھلک باشندوں کو وہ حقوق دینا جو برطانیہ عظمیٰ کے کیتھلک باشندوں کو نصیب نہ تھے اس سے زیادہ ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی عنان ایک گورنر کے ہاتھ میں دی گئی اور مجلس واضع قوانین کے ارکان کا انتخاب تاج کی طرف سے ہونے لگا۔ ان مراعات کو انگلستان کے متعصب طبقے نے جو فرانسیسی کیتھلکوں کے خلاف تھا بُری نظروں سے دیکھا لیکن اسکا خوشگوار اثر یہ پڑا کہ اہل کناڈا نے اپنے پیمان وفا کو نہیں توڑا اور ان کے لیڈروں نے اس قانون کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور اس کو اپنے حکمرانوں کی وسیع نظری اور فیاضی سے تعبیر کیا۔

اضطراب کی نشوونما جنگ آزادی کے دوران میں جو کوشش یورش کی امریکنوں کیطرف سے ہوئی وہ آسانی سے مسترد کر دی گئی۔ اور ۱۷۸۳ء میں اختتام جنگ کے بعد حکومت برطانیہ کو اُن کثیر التعداد مزارعین کے بسانے کے لیے انتظام کرنا پڑا۔ جو باغی نو آبادیوں سے خانماں برباد ہوے تھے اور تاج کے واسطے جانیں بھینٹ دے چکے تھے انھیں سے ہزاروں کناڈا چلے آئے مگر چونکہ دریاے سنٹ لارنس کے سواحل پر فرانسیسی قابض تھے اس وجہ سے وہ بالائی کناڈا کی زرخیز زمین پر آباد ہو گئے۔ اب یہاں پھر اضطراب نے سر اُٹھایا۔ اور اُنھوں نے اُن ہی حقوق کا مطالبہ کیا جو اُن کو اپنے وطن میں حاصل تھے۔ اور "انگلش سول قانون" کیلیے صداے احتجاج بلند کرنا شروع کر دی۔ خود فرانسیسی انگریز ججوں کی انصاف کشی سے عاجز آ گئے تھے۔ اور وہ اپنے قانون کو انگریزوں کے ہاتھوں سے نافذ ہوتے ہوے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لہذا اس بے چینی کو رفع کرنے کی غرض سے ۱۷۹۱ء میں کانسٹی ٹیوشنل ایکٹ پاس کیا گیا بالائی کناڈا میں فرانسیسی نہیں تھے ان کی آبادی صرف زیریں کناڈا کے عرض و طول میں پھیلی ہوئی تھی۔ لہذا یہ مناسب سمجھا گیا کہ دو قوموں کے مطالبات کو مدنظر رکھتے ہوے کناڈا کی سیاسی تقسیم دو حصوں میں کر دی جائے۔ ہر حصہ کو کونسل قانون سازی گئی اور اس کے ارکان کا انتخاب

تاج کی طرف سے ہونے لگا۔ زیرین کناڈا کی مجلس کے ارکان کی تعداد کم از کم سولہ اور بالائی کناڈا کے ارکان مجلس کی تعداد کم از کم پچاس مقرر کی گئی۔ اور انتخاب کثرت آرا سے رکھا گیا۔ برطانوی دارالعوام نے جہازرانی اور تجارت کے قیام کے لیے محاصل وصول کرنے کا حق اپنے ہاتھ میں رکھا لیکن مجلس کو اختیار دے دیا کہ وہ جس طرح چاہے اس روپیہ کو ملک کی بہبودی کیلیے صرف کرے۔ کچھ دنوں تو حالات حسب توقع ترقی کرتے رہے لیکن انیسویں صدی کے آغاز سے پھر بےچینی نے سر اُبھارا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک قوم کا دوسری قوم پر حکومت کرنا بڑا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اور حالات کی موافقت میں بھی دشواریاں ضرور لاحق ہوتی ہیں۔ زیرین کناڈا میں بدقسمتی سے حالات و واقعات ناموافق تھے۔ کیونکہ جو اشخاص وقتاً فوقتاً گورنر بنا کر بھیجے گئے تھے وہ اعلٰی قابلیت کے نہ تھے۔ یورپ اس وقت چولا بدل رہا تھا۔ طاقتور بغاوتوں نے جدید نظامات اساسی اور عظیم سلطنتوں کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا تھا اور ان ہنگامہ آرائیوں کی صدائے بازگشت کناڈا تک پہنچ رہی تھی۔ نئے خیالات، نئے جذبات وحسیات، نئے ولولے اور حوصلے رونما ہو رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مغرب کی دنیا کروٹ لے کر رہیگی۔ دوسری طرف کناڈا کے برطانوی گورنروں میں نہ تدبر و سیاست تھی نہ اتنی اہلیت کہ وہ حالات پر قابو پا سکتے۔ اور مطلع کو غبار آلود ہونے سے محفوظ رکھ سکتے۔ جریدہ "لاکناڈین" اپنی طاقتور آواز میں اس آگ کو بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری طرف سر ہنری کریگ جو اس وقت گورنر تھا۔ اُس نے فضا کا صحیح مطالعہ نہیں کیا۔ اور بغیر انجام پر غور کیے ہوے اسپیکر پنیٹ کو محض اس بنا پر نوکری سے خارج کر دیا کہ وہ "لاکناڈین" سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اسی پر اکتفا نہیں ہوئی بلکہ مسٹر بڈرڈ و نیز دیگر رہنمایان تحریک کو مغویانہ تحریرات شایع کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن برطانیہ کی وزارت نے گورنر کے ان احکام پر مہر توثیق نہیں ثبت کی اور اسکی شکست مجلس کی رائے سے اظہار مخالفت کرتے ہوے سنہ ۱۸۱۱ء میں اس کو انگلستان بُلا لیا۔ تشدد بے سود ثابت ہوا تھا اب نئے گورنر کو دلجوئی کی پالیسی کے

Sir Henry Craig — La Canadian — Mr Bedard — Speaker Panet

ساتھ بھیجا گیا۔ مجالس قانون ساز کا استحکام کیا گیا۔ فوجی عہدے برقرار کیے گئے اور سینیٹ کو مجلس میں ایک نشست دیدی گئی۔ انگریزوں کو اس عاقبت اندیشی کا ثمر یہ ملا کہ جب ۱۸۱۲ء-۱۸۱۵ء میں جنگ ہوئی تو اہل کناڈا نہ صرف پیمانِ وفا پر ثابت قدم رہے بلکہ حملہ آوروں کو ہزیمت دے کر پسپا کرنے میں حکومت کے پہلو بہ پہلو قربانیاں کیں۔ مسٹر گولڈون اسمتھ[1] نے اہل کناڈا کی وفاداری کے متعلق کیا سچ کہا ہے :-

"یہ وہ وقت تھا کہ فرانسیسی کناڈین براعظم امریکہ کے برطانوی مصنوعات کے
تحفظ کے لیے آخری توپ داغنے کے لیے مستعد تھے۔"

دنیا کی تاریخ میں صلح جوئی کی پالیسی کو کبھی اس سے بہتر ثمر نہیں ملا۔

ریاست ہائے متحدہ سے خاتمہ جنگ کے بعد سر جان شیر بروک[2] گورنر مقرر ہوا جو اپنے پیشرو کی طرح آزاد خیال واقع ہوا تھا اور اس نے محسوس کر لیا تھا کہ حکومت کناڈا کی کامیابی کے لیے مجلس کا وجود ضروری تھا۔ بدقسمتی سے شیر بروک صرف دو برس سے کچھ زیادہ زمانہ تک برسر حکومت رہا۔ اور اس کی مجلس سے اتحاد عمل کی کوششیں انگلستان کے ارباب حل و عقد کی نگاہوں میں مشکور نہ ہو سکیں۔ اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ برطانوی وزارت نوآبادیات کے ساتھ بیداد کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کا منشا یہ ضرور تھا کہ نوآبادیات کو حقیقی خود مختارانہ حکومت کبھی نصیب نہ ہو اور اہل کناڈا بچوں کی طرح گڑیوں سے بہلے رہیں۔ دوسری طرف جیسا کہ براڈشا[3] نے اپنی تصنیف[4] "کناڈا میں حکومت خود اختیاری" میں تحریر کیا ہے :-

"کناڈا کا مسئلہ اس وقت چھڑا جبکہ یورپ میں تحریک آزادی کا شباب تھا،
اور فرانسیسی کناڈین انقلاب فرانس سے متاثر ہو رہے تھے۔ نوآبادیات

---

[1] Goldwin Smith

[2] Sir John Sherbrooke

[3] Bradshaw.

[4] Self Government

F. Bradshaw [illegible] in Canada
P. S. King and Son, London [illegible]

ذمہ دار منظم حکومت کے لیے مضطرب ہو رہی تھیں۔"

جنگ آزادی کے مطالعہ سے ایک امر واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کسی قوم کو ابتداءً تھوڑی سی سیاسی آزادی ملجاتی ہے تو وہ زیادہ کی حرص سے مضطرب ہو جاتی ہے یہ کچھ کنا ڈا ہی پر منحصر نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی انقلاب ہوا ہے ایسی حالت ضرور مشاہدہ میں آئی ہے۔ یہی وہ جائز اور ولولہ خیز جذبہ ہے جو آزادی کی جدوجہد میں ہمارا محرک رہتا ہے۔ اور "بےچینی" اور "اضطراب" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(باقی دارد)

لمعات ثاقب

حضرت ثاقب قزلباش کا تازہ کلام

معلوم تھا یہ رسم دنیا نباہتا تھا — کہتا تھا میں کہ کیا ہی جب دل کراہتا تھا

برباد کر کے چھوڑا آپس کے مفسدوں نے — جو کچھ میں چاہتا تھا وہ دل نہ چاہتا تھا

پوچھو زمیں سے جو کچھ بیمار غم پہ گزری — ذرے تڑپ رہے تھے جس جا کراہتا تھا

بیگانے اور اپنے خوش تھے مری فنا سے — انکی بھی تھی یہ مرضی گردوں بھی چاہتا تھا

کیا ضبط درد کرتا دل کا علاج لیکن — جو کچھ میں کہہ چکا تھا اسکو نباہتا تھا

بے التفاتیوں سے دل مرگیا ہے ورنہ — کیا کیا نہ تھیں مرادیں کیا دل نہ چاہتا تھا

کوئی تو داد دیتا اس درد دل کی آخر — جب تم نہ بولتے تھے تب میں کراہتا تھا

محشر میں میری چپ سے باقی رہی مروت — زخموں نے کہدیا سب جو کچھ میں چاہتا تھا

اب تک نہ سمجھی دنیا اس طول زندگی پر
تم سے فلک سے ثاقب کیونکر نباہتا تھا

(۵)

میر انیسؔ کا ایک مرثیہ

(از قلم خان صاحب نواب مرزا جعفر علی خان صاحب آثرؔ بی۔ اے)

میر انیسؔ کا کلام اتنی اور اسقدر مختلف خوبیوں کا مجموعہ ہے کہ ذہن اُن کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ بڑے بڑے خوش فہم بہت کچھ بیان کرنے کے بعد اعتراف نارسائی کرتے ہیں۔ میرا قلم اُٹھانا چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق ہے۔ البتہ ایک فرق ہے۔ دوسروں نے اس چمن کے گلہائے رنگ رنگ سے جھولیاں بھر لی ہیں، نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

میں نے ایک وقت میں ایک ہی پھول سے آنکھ لڑائی اور اسکی نکہت بیزی و عشوہ طرازی میں محو ہو گیا۔ اس طرح سیرِ گل سے جو نقوش دل پر مرتسم ہوئے ناظرین خیاباں کی نذر ہیں۔

زیرِ نظر پھول (مرثیے) کا انتخاب کسی خاص مقصد کے تابع نہیں کیا گیا ہے۔ نظامی پریس بدایوں کے مراثیِ انیس کی پہلی جلد کا پہلا مرثیہ یہی ہے۔ اسی پر خامہ فرسائی شروع کر دی۔

دشتِ وغا میں نورِ خدا کا ظہور ہے
ذرّوں میں روشنیِ تجلیِ طور ہے
اک آفتابِ رُخ کی ضیا دور دور ہے
کوسوں زمینِ عکس سے دریائے نور ہے
اللہ رے حُسن طبقۂ عنبر سرشت کا
میدانِ کربلا ہے نمونہ بہشت کا

امام حسینؑ کو نورِ خدا کہنے سے نہ صرف اُن کی شان و علوئے مرتبت کا اظہار ہوا بلکہ یہ پہلو نکلا کہ حسینؑ حق کی طرف تھے اور حق اُن کی طرف تھا۔ ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے کہ پنجتن پاک کی خلقت نورِ یزداں سے ہوئی ہے۔ کوئی قدیم شاعر کہتا ہے ؎

خدا کے نور سے پیدا ہوئے ہیں پانچوں تن
محمدؐ است و علیؑ فاطمہؑ حسینؑ و حسنؑ

اس نور کے پرتو نے دشت کے ذرّوں میں برقِ طور کی تجلی پیدا کر دی۔ تیسرے مصرع میں

نورانیت کی بنا پر چہرۂ اقدس کو آفتاب کہا جس کی ضیا دور تک پھیلی ہوئی ہے اور جس کے عکس سے زمین پر دریائے نور رواں معلوم ہوتا ہے۔ امام کے فیض قدم سے تپتا ہوا بیابان جس میں آگ برستی تھی نمونۂ بہشت عنبر سرشت بن گیا۔ پہلے ہوا سے آنچیں نکلتی تھیں اب نسیم کے جھونکوں کے ساتھ خوشبو کی لپٹیں آتی ہیں۔

گرمی کی دوپہر کی دھوپ، وہ بھی عرب کے ریگستان کی ہوا میں بہا بیت اور وہ چمکا چوند ہوتی ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ ایک سراپا نور کے ورود نے ایسے صحرا کی تڑپ میں بجلیاں بھر دیں، ہر ذرہ رشکِ برق طور ہو گیا۔ اس جلوہ زار تجلی میں اس سے بھی زیادہ نورانی منظر پیش کر دینا میں اور صرف انیس کا حصہ ہے۔ یہ تو حضور کے جسم سے جو نور چھن چھن کے نکل رہا تھا اُسکی ضیا باری تھی۔ جہاں آفتاب رُخ عکس فگن تھا وہاں گمان ہوتا تھا کہ ایک دریائے نور موج زن ہے اور اس دریائے نور میں اپنی گرد و پیش کی نورانیت سے تجلی زیادہ ہے ورنہ اُسکی موجودگی میں اسکا علم کیونکر ہوا۔

بلاغت کلام کا معجزہ دیکھو کہ پھر بھی ترقی کی گنجائش باقی رہی۔ یہ سب تو عکس رخسار کا کرشمہ تھا خود اُن رخساروں کا کیا عالم ہوگا؟

حیراں[1] زمیں کے نور سے ہے چرخ لاجورد	مانند کہربا ہے رُخِ آفتاب زرد
ہے رشکِ فضائے ارم وادیٔ نبرد	اُٹھتا ہے خاک سے طبق نور جائے گرد

حیرت سے حاملانِ فلک ان کو تکتے ہیں
ذرّے نہیں ستارے زمیں پر چمکتے ہیں

پہلے بند میں عکس رخ سے دشت کربلا کا عالم دکھا کر تخیل نے فضائے بسیط و چرخ عنبری کا رُخ کیا۔

پہلا مصرع بادی النظر میں دعوے بے دلیل معلوم ہوتا ہے، چرخ لاجورد میں حیرانی کا مادہ کہاں مگر نہیں، دوسرے مصرع میں ثبوت موجود ہے۔ اظہار حیرت خاص طور پر آنکھوں سے ہوتا ہے اور آفتاب "چشم فلک" ہے۔ جو نور رُخ امام کے مقابل نہ صرف افراط حیرت سے اپنے حلقے میں

---

[1] نظامی پریس کے نسخے میں یونہی ہے۔ مجھے صحیح نہیں معلوم ہوتا، غالبًا ساکنان فلک ہوگا مستعمل حاملان عرش ہے نہ کہ حاملان فلک۔ آثر

گردش کرنا بھول گیا بلکہ مانند کہربا زرد ہو گیا، اسی طرح تیسرا مصرع دعوے ہے اور چوتھا دلیل، ان مصرعوں میں مزید خوبی یہ ہے کہ ہر مصرع ربط کے علاوہ ایک جدید تاثر امام کے چہرے کی نورانیت کا پیش کرتا ہے۔ دشت کے ذروں میں طور کی روشنی پہلے ہی کہہ چکے اب گرد کو تحت نور سے تعبیر کیا میں بھولا! اس میدان میں گرد کا گذر کہاں۔ اسی تحت نور کو غبار کہہ لو جو زمین کی ضو فشانی سے بلند ہوتا ہے چرخ کا رنگ لاجوردی ہے جس میں ستارے چمکتے ہیں، مگر اس دشت کا ہر ذرہ نہ صرف اختر تابندہ ہے بلکہ ان ستاروں کا آسمان بھی نورانی ہے جب ہی تو ساکنان فلک حیرت سے تکتے ہیں۔

ہے آب نہر صورتِ آئینہ جلوہ گر ؎ تاباں ہے مثل چشمۂ خورشید ہر بھنور
لہریں بسان برق چمکتی ہیں سر بسر ؎ پانی پہ مچھلیوں کی ٹھہرتی نہیں نظر
یہ آب و تاب ہے کہ گہر آب آب ہیں
دریا تو آسماں ہے، ستارے حباب ہیں

پہلے دو بندوں میں دشت کی مجموعی ہیئت دکھائی، اس بند میں نہر کو مخصوص کر لیا جس میں آئینے کی طرح ضیا اور ضیا کا انعکاس بھی ہے، ہر گرداب چشمۂ آفتاب ہے۔ دوسرے مصرع میں بھنور کی رعایت سے آفتاب کے ساتھ لفظ چشمہ کا استعمال مراعات النظیر کی عمدہ مثال ہے۔ رعایت لفظ اسی حد تک جائز ہے۔ اس سے تجاوز بے جا تصنع ہے۔ ع

لہریں بسان برق چمکتی ہیں سر بسر

لفظ سر بسر نے ہر موج کا پیچ و خم الگ الگ دکھا دیا اور برق سے پوری پوری مشابہت تھی ورنہ محض بجلی کی پھیلی ہوئی روشنی کی طرف خیال جاتا، اب ہر موج برق سانپ کی طرح لہرا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پانی سے مانوس اور پانی سے کھیلنے والی مچھلیوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ بیت شاعرانہ صداقت اور حقیقت نگاری کا مرقع ہے۔

بعض سیلانی موجوں کی پسلی پھڑکی کہ موتیوں کو اپنی آب و تاب پر بہت غرہ ہے چلو ان کو شرمائیں، غوطہ لگایا اور تہ تک پہونچیں، مگر راستے میں اپنی بہت کچھ تابندگی پانی کو مستعار دے گئیں

(ملحوظ خاطر رہے کہ پانی سے گذرنے میں روشنی کی تیزی کم ہو جاتی ہے) قعر دریا تک پہونچتے پہونچتے ان موجوں کے رشحات میں پھر بھی اس قدر ضو رہ گئی کہ موتی شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ موتیوں میں برق کی سی چمک نہیں ہوتی بلکہ لعاب دار ضیا ہوتی ہے توازن قائم رکھنے کو موجوں کی روشنی کو مدھم کیا تاکہ موتیوں کی طرح کی مگر اُن سے اُنہیں کے درجہ میں تیز تر روشنی باقی رہ جائے اور ایسی روشنی بھی موتیوں کی ضیا ماند کرنے کو کافی ہو۔

جب نہر شہ ہر لحظہ خورشید ہے اور ہر موج برق ہے تو نہر کے آسمان ہونے میں کوئی شک و شبہہ نہیں رہا۔ آسمان کیلئے ستارے ضروری ہیں، حباب ستارے بن گئے۔

پرتو فگن ہوا جو رُخِ قبلۂ انام ۵۴ مشہور ہو گئی وہ زمیں عرش احتشام
اور سنگریزے بن گئے دُرِّ نجف تمام صحرا کو مل گیا شرف وادی السلام
کعبے سے اور نجف سے بھی عزت سوا ہوئی
خاک اُس زمین پاک کی خاکِ شفا ہوئی

اس بند میں ارض کربلا کے شرف و بزرگی و کرامت کی طرف اشارہ ہے جس سے شہادت حسین کی عظمت منجلی ہوتی ہے۔ شہید راہ خدا کے لہو نے یہ کہ اس سرزمین کو پاک و مطہر اور فیوض و برکات کا سرچشمہ بنا دیا، رفعت میں عرش کے ہم پایہ ہے، اس کے سنگریزے دُرِ نجف کے ہم سنگ ہیں، اس کا صحرا وادی السلام (مضافات نجف) کی طرح پاکیزہ و پر صفا ہے، اسکی خاک اکسیر ہے اور یہ ایسا شرف ہے جو اور کسی ارض مقدس کو عطا نہیں ہوا۔ اور کیوں نہ ہو شہادت شبیر نے اس کے ذرے ذرے کو نکھارا ہے، عزت میں کعبہ و نجف سے کیوں سوا نہ ہو اس پیاسے کی خوابگاہ ہو جس نے حق کی حمایت میں سب کچھ قربان کر کے اسلام کے جسمِ مُردہ میں تازہ روح پھونک دی۔

پھیلا جو نور مہر امامت دمِ زوال ۵۵ ذرّوں سے واں کے آنکھ ملانا ہوا محال
سارے نہال فیض قدم سے ہوئے نہال اختر بنے جو پھول، تو شاخیں بنیں ہلال

سب تتے تمام آئینۂ نور ہو گئے
صحرا کے نخل سب شجرِ طور ہو گئے

لفظ زوال میں صنعت براعت استہلال ہے یعنے آفتابِ امامت کے خون میں ڈوبنے کا وقت قریب آگیا۔ ہلال سے شاخوں کی تشبیہ میں جو لطافت اور تازگی ہے محتاج بیان نہیں۔ بیت میں بھی ہی التزام ہے

۵۶
غُل تھا زہے حسین کی شوکت زہے وقار
گویا کھڑے ہیں جنگ کو محبوبِ کردگار
رُخ سے عیاں ہے دبدبۂ شاہِ ذوالفقار
ہے نورِ حق جبین منور سے آشکار
کیونکر چھپے نہ ماہ دوہفتہ حجاب سے
چودہ طبق میں نور ہے اس آفتاب سے

اس بند میں گریز ہے اور لفظ لفظ سے امام کے دبدبۂ و وقار و صولت و ہیبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اس کے بعد پانچ بندوں میں "سراپا" ہے وہ سب ایک جگہ درج کیے جاتے ہیں۔

۵۷
یہ روئے روشن اور یہ گیسوئے مشک فام
یاں شام میں تو صبح ہے اور صبح میں ہے شام
ہالے میں یوں نظر نہیں آتا مہِ تمام
قدرت خدا کی نور کا ظلمت میں ہے مقام
زلفوں میں جلوہ گر نہیں چہرہ جناب کا
ہے نصف شب میں آج ظہور آفتاب کا

۵۸
قرباں کمان ابروئے مولیٰ پہ جان و دل
گر ماہ نو کہیں تو ہے تشبیہ مبتذل
چشم غزال دشتِ ختن چشم سے خجل
دیکھا جسے کرم سے خطائیں ہوئیں بحل
پُتلی بسان قبلہ نما بے قرار ہے
گریاں ہیں وہ یہ گردش لیل و نہار ہے

۵۹
رخسار ہیں ضیا میں قمر سے زیادہ تر
جن پر ٹھہر سکے نہ کبھی شمس کی نظر
ریش مخضب اور یہ رُخ شاہ بحر و بر
پیدا ہیں صاف معنی والیل والقمر
قرآن سے عیاں ہے بزرگی امام کی

کھائی قسم خدا نے اسی صبح و شام کی

کس منہ سے کیجیے لب جاں بخش کا بیاں [۱۰] جو سی جنھوں نے احمد مختار کی زباں
کیا در آبدار ہیں اس دُرج میں نہاں گویا کہ موتیوں کا خزانہ ہے یہ دہاں
ذرے زمیں پہ عکس سے سارے چمک گئے
جس وقت یہ کھلے تو ستارے چمک گئے

شمع حریم لم یزلی ہے گلوئے شاہ [۱۱] تاریک شب میں جیسے ہویدا ہو نور ماہ
اے چرخ بے مدار یہ کیسا ستم ہے آہ شمشیر شمر اور محمدؐ کی بوسہ گاہ
جس پر رسول ہونٹوں کو ملتے ہوں پیار سے
کٹ جائے کربلا میں وہ خنجر کی دھار سے

ان بندوں میں اکثر صنائع لفظی و معنوی ہیں آج کل اُن کی قدر نہیں دعا حت بے سود ہے۔
البتہ آخری بند میں "شمشیر" اور "شمر" اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ دونوں نے مل کر ایک دوسرے کی
بے رحمی، جلادی، اور خونریزی کو محض اصوات سے آئینہ کر دیا۔ شمشیر شمر اُس گلوئے نازنین پر جو بوسہ
گاہ محمدؐ رہ چکا ہے اُسی بے دردی سے رُک رُک کر چل رہی ہے جس طرح چوب خشک پر آرہ
کش کا آرہ چلتا ہے۔ اور "شمشیر شمر" سے مشابہ آواز نکلتی ہے۔

منظور یاں تھی مدح گلوئے شہ امم [۱۲] یاد آ گئی مگر یہ حدیث غم و الم
مسجد میں جلوہ گر تھے رسول فلک حشم ملتے تھے ذکر حق میں لب پاک دمبدم
روشن تھے بام و در رُخ روشن کے نور سے
آئینہ بن گئی تھی زمیں تن کے نور سے

یہاں سے میر صاحب نے ایک روایت کو ربط دیا ہے جس کی رومانیت میں غضب کی کشش
مگر اسی کے ساتھ جراحت ریزی ہے، اُس پر انیس کا معجز نگار قلم! شاید ہی کوئی زبان اسکے آرٹ
اور آرٹ کے ساتھ بے مثل نفسیاتی تحلیل کی نظیر پیش کر سکے۔ سیرت نگاری کا یہ شاہکار تعریف سے مستغنی ہے۔

[۱۳]
تھا جو ستون کہ رکن رسالت کا تکیہ گاہ ۔ کرسی بھی اُسکی پشت کی تھی ڈھونڈھتی پناہ
تھا جس حصیر پہ وہ دو عالم کا بادشاہ ۔ حسرت سے عرش کرتا تھا اس فرش پر نگاہ
اوج زمیں بہشت بریں سے دو چند تھا
منبر کا نہ فلک سے بھی پایہ بلند تھا

[۱۴]
اصحاب خاص گرد تھے انجم کی طرح سب ۔ تاباں تھا بیچ میں وہ مہ ہاشمی لقب
سر پر ملک صفات مگس راں تھے دو عرب ۔ جبریل تکیے ہوئے تھے زانوئے ادب
خادم بلال و قنبر گردوں اساس تھا
نعلین اُسکے پاس عصا اُسکے پاس تھا

[۱۵]
گیسو تھے وہ تفسیر واللیل اذا سجا ۔ رُخ سے عیاں تھے معنی والشمس والضحیٰ
وہ ریش پاک اور رُخ سردار انبیا ۔ گویا دھرا تھا رحل پہ قرآں کھلا ہوا
اوڑھے سیہ عبا جو وہ عالم پناہ تھا
کعبے کا صاف حاجیوں کو اشتباہ تھا

[۱۶]
پہلو میں بادشاہ کے تھا جلوہ گر وزیر ۔ سردار دیں، علی ولی، خلق کا امیر
دونوں جہاں میں کوئی نہ دونوں کا تھا نظیر ۔ احمد تھے آفتاب توحید ر مہ منیر
ظاہر میں ایک نور کا دو جا ظہور تھا
گر غور کیجیے تو وہی ایک نور تھا

[۱۷]
مصروف وعظ و پند تھے سلطان مشرقین ۔ جو گھر سے نکلے کھیلتے زہرا کے نور عین
نانا بغیر دونوں نواسوں کو تھا نہ چین ۔ بڑھ جاتے تھے حسن کبھی آگے کبھی حسین
کہتے تھے دیکھیں کون قدم جلد اُٹھاتا ہے
نانا کے پاس پہلے بھلا کون جاتا ہے

بچوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا خاص جذبہ ہوتا ہے، مگر زہرا کے نور عین محبت سے ل

میں بازی لے جانا چاہتے ہیں۔

وہ گورے گورے چہروں پہ زلفیں ادھر اُدھر ۱۸؎ کُرتے گلوں میں نور بدن جن سے جلوہ گر
اختر سے وہ چمکتے ہوئے کان کے گہر رشک ہلال طوق، گلے غیرت قمر

ہیکل پہ نقش نام خدائے جلیل کے
تعویذ گردنوں میں پر جبرئیل کے

تصویر دو بچوں کی ہے، کسی ایسے جذبے یا کیفیت کی نہیں جو مصور کے دائرۂ عمل سے خارج ہو مگر شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا چابکدست مصور گذرا ہو یا آئندہ وجود میں آسکے جس کا موقلم دو بچوں کی ایسی ہی حسین و سادہ و دلکش تصویر کھینچ دے جو اس خوبی سے ان چھ مصرعوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہے۔

چھٹے مصرع کی ندرت اور ندرت کے ساتھ سادگی و بے ساختگی وجد آفریں ہے۔ استعارہ بالکنایہ کی شاید ہی اس سے بہتر مثال مل سکے۔ پوری جنگ خیبر کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا اور ضربت حیدری کی صدا کانوں میں گونجنے لگی۔ اس کی چپیٹ میں جبرئیل کے تین پر بھی آگئے تھے۔ انکا مصرف اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا کہ حسنین کی گردنوں میں پر طاؤس کے بجائے انکے تعویذ پڑیں۔

مسجد میں آئے ہنستے ہوئے جب یہ گلبدن ۱۹؎ خوشبو سے صحن مسجد جامع بنا چمن
تسلیم کو حسین سے پہلے جھکے حسن خوش ہو کے مسکرانے لگے سرور زمن

بڑھ بڑھ کے خم سلام کو چھوٹے بڑے ہوئے
بیٹھے رہے رسول، ملک اٹھ کھڑے ہوئے

"ہنستے ہوئے" کا ٹکڑا استادانہ ہے جس نے صحن مسجد میں ان گلبدنوں کی خوشبو کو پھیلا کر رشک چمن بنا دیا۔ تیسرے مصرع نے ان بچوں کی باہمی بزرگداشت کو اس طرح واضح کیا جس کی قدر کرنے والے اب تو خیر انیس کے زمانے میں بھی کم ہونگے۔ خردسال بچوں کو تہذیب کی یہ مراتب تعلیم کہ جب دو بچے ایک ساتھ کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوں تو چھوٹے بچے کو بڑے بچے سے پہلے

سلام کو نہ جھکنا چاہیے صرف مخصوص گھرانوں میں محدود ہے ۔

بیٹوں کو تھا علی کا اشارہ کہ بیٹھ جاؤ ؎۵۲ لازم نہیں کہ وعظ میں نانا کو تم ستاؤ
پھیلا کے ہاتھ بولے محمد کہ آؤ آؤ شبیر نے کہا ہمیں پہلے گلے لگاؤ
بھائی حسن جو آپ کی گودی میں آئیں گے
ہم تم سے نانا جان ابھی روٹھ جائیں گے

اس بند میں اور بعد کے متعدد بندوں میں انیس نے مشکلیں پیدا کی ہیں اور پھر اُن کو نہایت خوش اسلوبی سے حل کیا ہے ۔ ایک بات دیکھنے کی یہ ہے کہ دونوں دلبندان بتول میں چشمک بھی ہے اور انتہائی محبت بھی ہے ۔ مگر چشمک ہو یا محبت خاندان نبوت کی شان وقار بردباری میں فرق نہیں آتا ۔ عام بچوں کی طرح آپس میں لڑتے جھگڑتے نہیں ۔ کردار نگاری کی معراج دیکھو کہ دونوں خردسال ہیں دونوں کی باتیں بھولی بھولی ہیں تاہم چھوٹے کی باتوں میں بڑے سے زیادہ سادگی اور الھڑپن ہے ۔ پوری روایت میں یہی امتیاز نمایاں ہے ۔

امام حسن بڑے ہیں، امام حسین چھوٹے ہیں ۔ دونوں آغوش نبی میں پہلے داخل ہونے پر اڑے ہیں مگر بڑا چھوٹے کو جھڑکتا ہے نہ چھوٹا بڑے سے دوبدو کرتا ہے بلکہ امام حسین اپنے نانا سے عرض کرتے ہیں کہ ؎

بھائی حسن جو آپ کی گودی میں آئیں گے ہم تم سے نانا جان ابھی روٹھ جائیں گے

وہی بچپن کی ضد ہے مگر کس بے پناہ سادگی، دلکشی اور معصومیت کے ساتھ ۔ بڑے بھائی کے پاس ادب کا بھی اظہار ہے اپنی کمزوری کا بھی اعتراف ہے، نانا کی محبت پر اعتماد بھی ہے، ناز بھی ہے، کیا کچھ نہیں ہے ۔

بولے حسن کہ واہ ہمیں اور کریں نہ پیار ؎۵۳ اقرار کر چکے ہیں شہنشاہ نامدار
بولے بچشم نم یہ حسین فلک وقار دیکھیں تو کون ہوتا ہے کاندھے پہ اب سوار
سب سے سوا جو ہیں سو ہمیں اُنکے پیارے ہیں
آگے نہ بڑھیے آپ کہ نانا ہمارے ہیں

حسین اور روٹھنے کی دھمکی دیں۔ امام حسن کو اُلجھن پیدا ہوئی کہ ایسا نہ ہو کہ نانا اُسکا دل رکھ لیں اور مجھ کو گود میں نہ لیں۔ دیکھو امام حسن امام حسین کے سحر حلال کے اثر کو کس طرح زائل کرتے ہیں۔ مخاطب کرتے ہیں چھوٹے بھائی کو اور یاد دلاتے ہیں نانا رسول کو کہ ع

اقرار کر چکے ہیں شہنشاہ نامدار

رسول خدا کا وعدہ۔ پھر حسین سا قدر شناس وعدہ (امت پر سب کچھ نثار کر دینے کا وعدہ طفلی ہی میں تو کیا تھا) یقین ہو گیا کہ میری محبت بھی نانا جان کو ایفائے وعدہ سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں نے اعلان کیا کہ شکست کا اعتراف ہے، مگر جان نیو۔ پر گراں ہے۔ اور دوسرا میدان تلاش کرتے ہیں۔ ع

دیکھیں تو کون ہوتا ہے کاندھے پہ اب سوار

اس میدان میں وعدے کی روک ٹوک نہیں تھی سرت پیش قدمی کی ضرورت تھی۔ چیلنج دینے اور اُسکے قبول ہونے کا انتظار کرنا پڑا، اتنے میں حسن ایک قدم آگے تھے ہاتھ سے روک نہیں سکتے پاس ادب مانع ہے، لہذا فرماتے ہیں کہ سہ

سب سے سوا جو ہیں سو ہمیں اُنکو پیارے ہیں ۔۔۔ آگے نہ بڑھیے آپ کہ نانا ہمارے ہیں

یہ عقیدہ دل میں راسخ ہے اور بجا طور پر راسخ ہے کہ نانا ہمیں سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ امام حسن سے تو صرف اقرار تھا یہاں اس قول کی تکرار ہو چکی ہے کہ

"حسین منی وانا من الحسین"

امام حسین کا اسی طرف اشارہ ہے مگر امام حسن "نانا ہمارے ہیں" کے لفظی معنے لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کیا ہمارے نانا نہیں ہیں؟

بھائی سے تب کہا یہ حسن نے بہ التفات ۔۔۔ بے وجہ ہم سے روٹھے ہو تم اے نکو صفات
نانا ہمارے کیا نہیں سلطان کائنات ۔۔۔ ہوتی ہے ناگوار تمھیں تو ذرا سی بات
غصہ نہ اتنا چاہیے خوش خو کے واسطے

مچلے تھے یوں ہی بچۂ آہو کے واسطے

یہ سن کے منہ علی کا لگے دیکھنے رسول ۲۳ ہنسکر کہا یہ دونوں ہیں میرے چمن کے پھول
میں چاہتا ہوں ایک کی خاطر نہ ہو ملول روئینگے یہ تو گھر سے نکل آئیں گی بتول
ہوئے نہ رنج میرے کسی نورِ عین کو
تم لو حسن کو گود میں میں لوں حسین کو

شبر سے سے پھر اشارہ کیا ہو کے بیقرار ۲۴ غصہ نہ کھاؤ پہلے تمھیں کو کرینگے پیار
پھر بولے دیکھکر سوئے شبیر نامدار آ اے حسین آ، تری باتوں کے میں نثار
چھاتی سے ہم لگائیں گے جان اپنی جان کر
دیکھیں تو پہلے کون لپٹتا ہے آن کر

دوڑے یہ بات سن کے برابر وہ خوش سیر ۲۵ پاس آئے آفتابِ رسالت کے دو قمر
لپٹے حسین ہنسکے اُدھر اور حسن اِدھر تھے پاؤں زانوؤں پہ تو بالائے دوش سر
نانا کے ساتھ پیار میں دونوں کا ساتھ تھا
گردن میں ایک اُنکا اور اک اُنکا ہاتھ تھا

پھر پھر کے دیکھتے تھے شہنشاہِ مشرقین ۲۶ گہ جانب حسن تو گہے جانب حسین
بیٹھے جو زانوؤں پہ وہ زہرا کے نورِ عین تھا تن کو لطف قلب کو راحت جگر کو چین
جھک جھک کے منہ رسول زمن چومنے لگے
اُنکا گلا تو اُن کا دہن چومنے لگے

شبیر چاہتے تھے کہ چومیں مرے بھی لب ۲۷ پر کچھ گلے کے بوسوں کا کھلتا نہ تھا سبب
نانا کے منہ کے پاس یہ لاتے تھے منہ کو جب جھک جھک کے چومتے تھے گلا سیدِ عرب
بھائی کو دیکھ کر جو حسن مسکراتے تھے
غیرت سے اُنکی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے

نانا نے حسن کا تو منہ چوما اور حسین کا گلا۔ بار بار منہ کے پاس منہ بھی لائے مگر گلے ہی کا انتخاب ہوا۔ اسپر قیامت یہ ہوئی کہ بوسۂ لب کے لذت یاب حسن مسکرا دیے (غالباً یہ مسکرانا اختیاری نہیں تھا، بلکہ لب مشتاق نبی نے اس کلی کو کم کم کھلنا سکھا دیا تھا)۔

۲۸
اُٹھے حسین زانوے احمد سے خشمگیں غصہ سے رنگ زرد اور آنکھوں پہ آستیں
رُخ پر پسینہ جسم میں رعشہ جبیں پہ چیں پوچھا کدھر چلے تو یہ بولے کہیں نہیں
گھر میں اکیلے تیوری چڑھائے چلے گئے
دیکھا نہ پھر کے سر کو جھکائے چلے گئے

اس بند میں "آنکھوں پہ آستیں" نے پھر تصویر کو ایک طفل خرد سال ہی کی تصویر رکھا۔

۲۹
بیت الشرف میں آئے جو شبیر نامدار کرتے کو منہ پہ رکھکے لگے رونے زار زار
دوڑیں یہ کہہ کے فاطمہ زہرا جگر فگار ہے ہے حسین کیا ہوا تو کیوں ہے اشکبار
تجھ کو رلا کے غم میں مجھے مبتلا کیا
قربان ہو گئی تجھے کس نے خفا کیا

۳۰
میرا کلیجا پھٹتا ہے اے دلربا نہ رو زہرا ہزار جان سے تجھ پر فدا نہ رو
سر میں نہ درد ہو کہیں لے مہ لقا نہ رو بس بس نہ رو حسین برائے خدا نہ رو
میری طرف تو دیکھو کہ بیتاب ہوتی ہوں
چادر سے منہ کو ڈھانپ کے لو میں بھی روتی ہوں

۳۱
تو منہ تو کھول اے مرے شبیر خوش خصال تر ہو گئے ہیں آنسوؤں سے گورے گورے گال
مل مل کے پشت دست سے آنکھیں کرو نہ لال سلجھاؤں آؤ الجھے ہوئے گیسوؤں کے بال
گھر سے گئے تھے ساتھ، جدا ہو کے آئے ہو
سمجھی میں کچھ حسن سے خفا ہو کے آئے ہو

۳۲
تم چپ ہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھر کے آئیں گزری میں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رلائیں

اُن سے نہ بولیو وہ تمہیں لاکھ گر منائیں   لو آئے جانے دو تمہیں چھاتی سے ہم لگائیں
واری اگر حسن نے رُلایا، بُرا کیا
پوچھوں گی کیا نہ میں مرے پیارے نے کیا کیا

ان بندوں میں ماں بیٹے کی محبت اور ماں کا اضطراب ایسے اسلوب سے نظم ہوا ہے کہ زبان تعریف سے قاصر ہے۔ خصوصاً ماں کی یہ اپیل۔ ع

چادر سے مُنہ کو ڈھانپ کے لو میں بھی روتی ہوں

نسائیت کا ایسا مرقع ہے جو انیس کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ حسینؑ سی عظیم شخصیت کو عہد طفلی میں کیسا ہونا چاہیے، اسکے متعلق انیس جو کچھ لکھ گئے اپنا جواب آپ ہے۔ اس نبض شناس فطرت کو دیکھو کہ زہراؑ کی بیتابی و دلدہی پر حسینؑ کو چپ نہیں کر دیتا مگر جب شبہ ظاہر کرتی ہیں کہ ہو نہ ہو حسنؑ نے خفا کر دیا ہے، ساتھ گئے تھے، اکیلے آئے ہیں تو چونکہ یہ بات حقیقت سے دور تھی اور اس کم عمر میں بھی حسینؑ گوگوارا نہ تھا کہ اُنکی خاموشی سے غلط فہمی پیدا ہو یا جادہ راستی و حق سے جس میں خیال و عمل دونوں شامل ہیں ہٹ جائیں، لہذا اگر یہ ضبط کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

(بولے حسین) ہم تو ہیں اس بات پر خفا [۳۳]   نانا نے چومے بھائی کے ہونٹ اور مرا گلا
تم اماں جان مُنہ کو تو سونگھو مرے ذرا   کچھ بوئے ناگوار ہے میرے دہن میں کیا
بھائی کے لب سے اپنے لبوں کو ملاتے ہیں
اب ہم نہ جائیں گے ہمیں نانا رُلاتے ہیں

اگر دل کے ٹوٹنے کی آواز کانوں میں آسکتی ہے تو آخری مصرع میں ہے۔

اب ہم نہ جائینگے ہمیں نانا رُلاتے ہیں

منھ رکھ کے مُنھ پہ بولی یہ زہرا جگر فگار [۳۴]   بوئے گلاب آتی ہے اے میرے گلعذار
چوما اگر گلا تو خفا ہو نہ میں نثار   تم کو زباں چوساتے تھے محبوب کردگار
یہ مشک میں مہک نہ گل یاسمن میں ہے

خوشبو اُسی دہن کی تمھارے دہن میں ہے

گل زہرا کے مُنھ سے بوئے ناگوار! مگر ماں کو دل کی تپکتی ہوئی رگوں کو آرام دینے کا بہانہ مل گیا۔ منھ کو سونگھا نہیں۔ بلکہ حسین کے منھ پر منھ رکھدیا۔ مگر حسین کی تسکین نہیں ہوتی بلکہ دل اور زیادہ اُمڈتا ہے ابتک تو یہ وہم تھا کہ مبادا دہن سے بوئے بد آتی ہے جس سے نانا کو گلا چومنے پر مجبور کیا جب یہ شک دور ہوگیا تو اس کے سوا کوئی وجہ امتیاز کی نہ رہی کہ نانا ہم سے زیادہ بھائی حسن کو چاہتے ہیں۔ زبان چوسائی تھی جب چوسائی تھی۔

کہنے لگے حسین یہ ماں سے بچشم نم ۵۲۵ کیا جانو تم، حسن سے ہمیں جلتے ہیں کم
یہ کیا انھیں پہ لطف و عنایت ہے دمبدم معلوم ہوگیا انھیں پیارے نہیں ہیں ہم
رو رو کے آج جان ہم اپنی گنوائیں گے
پانی نہ اب پئیں گے نہ کھانے کو کھائیں گے

انیس کی اجتہادی شان اور زبان کو جس طرف چاہنا موڑ دینا اور نازک فرق مفہوم پیدا کر دینے کا یہ کرشمہ ہے کہ عام روزمرہ "کھانا کھانا" ہے "مگر" کھانے کو کھائیں گے" نظم کیا۔ حالانکہ اسی کے بعد والے بند میں موجود ہے۔ ع

کاہے کو ماں جیئے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

لہٰذا یہ بدگمانی نہیں ہوسکتی کہ انیس صحیح روزمرہ سے ناواقف تھے۔ یہ شک سفاہت پر مبنی ہوگا کہ کھانا نہ کھائیں گے موزوں نہ کرسکے اور "نہ کھانے کو کھائیں گے" نظم کر دیا۔ ہم آپ اس مصرع میں صحیح روزمرہ موزوں کرسکتے ہیں (مثلاً نہ کھانا ہی کھائیں گے) تو انیس کا مرتبہ تو بہت بلند ہے۔ بات یہ ہے کہ انیس نے یہ اُپچ اسلیے کی تاکہ ذہن اُس قول کی طرف متبادر ہو جو انسان کی زبان پر انتہائے حزن والم میں جاری ہوتا ہے "اب ہم کھانا نہیں کھاتے، کھانا ہمکو کھاتا ہے" انیس نے اس تغیر سے یہ معنے پیدا کر دیے کہ اب کھانے میں مواد نہ ملے گا، اپنی خوشی سے نہ پانی پئیں گے نہ کھانا کھائینگے بلکہ جبراً و قہراً اور بے دلی سے۔ مگر ماں کی مامتا کب سمجھنے دیتی ہے۔ بیتاب ہو کے فرماتی ہیں ع

کاہے کو ماں جیئے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

ایسا ہراس طاری ہوا کہ حسین کو گود میں لے کر بابا کی خدمت میں روانہ ہوئیں۔ مصرع کی دھن میں ایک بند نقل کرنے سے رہ گیا۔

یہ بات سن کے ہو گیا زہرا کا رنگ فق ۳۶ بولی پسر سے رو کے وہ بنتِ رسول حق
صدقے گئی کرو نہ کلیجے کو میرے شق ہے ہے یہ کیا کہا، مجھے ہوتا ہے اب قلق
میرا لہو بہے گا جو آنسو بہاؤ گے
کاہے کو ماں جیئے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

یہ کہہ کے اوڑھ لی سرِ پُر نور پر ردا ۳۷ مونس نے ہن کے گود میں شبیر کو لیا
در تک گئی جو گھر سے وہ دلبند مصطفےٰ فضہ نے بڑھ کے بوذر و سلماں کو دی صدا
پیشِ نبی حسین کو گودی میں لاتی ہیں
ہٹ جاؤ سب کہ فاطمہ مسجد میں آتی ہیں

اللہ رے آمد آمد زہرا کا بندوبست ۳۸ ساتوں فلک تھے اوج شرافت سے جس کے پست
احمد کے گرد و پیش سے اٹھے خدا پرست انساں تو کیا ملک کو نہ تھی قدرتِ نشست
آئیں تو شاد شاد رسول زمن ہوئے
گھر میں خدا کے ایک جگہ پنجتن ہوئے

تعظیم فاطمہ کو اٹھے سید البشر ۳۹ دیکھا کہ چشم فاطمہ ہے آنسوؤں سے تر
خم تھے حسین دوش پہ ماں کے جھکائے سر تھا اِک ہلال مہر کے پہلو میں جلوہ گر
ماں کہتی تھی نہ روؤ مگر چپ نہ ہوتے تھے
آنکھیں تھیں بند ہچکیاں لے لے کے روتے تھے

گھبرا کے پوچھنے لگے محبوب ذوالجلال ۴۰ روتا ہے کیوں حسین، یہ کیا ہے تمہارا حال
بولیں بتول آج قلق ہے مجھے کمال رویا ہے یہ حسین کہ آنکھیں ہیں دونوں لال

آتے ہیں ہنستے روتے ہوئے گھر میں جاتے ہیں

شفقت بھی آپ ہی کرتے ہیں آپ ہی رولاتے ہیں

یہاں پھر انیس نے صحت احساس اور ماں کے دو متضاد جذبات کی ایسی بے مثل تصویر کھینچی ہے کہ دل عش عش کرتا ہے۔ ایک طرف حسین کو جو صدمہ پہونچا ہے اُسکا اظہار اور اُسکی وجہ دریافت کرنا ضروری ہے اُدھر باپ کا احترام اور باپ بھی کیسا جو سرخیل انبیا ہے۔ مگر ہائے ماں کا دل، اتنا مُنہ سے نکل ہی گیا۔ ع

شفقت بھی آپ ہی کرتے ہیں آپ ہی رولاتے ہیں

حالانکہ شفقت کے بعد رولانے کا نام لیا ہے کیونکہ شفیق رولائے گا تو کچھ مصلحت ہی ہوگی۔

اس کے بعد جو کچھ ہے ایک طرف تو سراسر منت سماجت ہے التجا ہے اور ایک طرف ماں کی محبت کا اظہار اور بیکسانہ اظہار جس نے ہر لفظ میں تاثیر کے نشتر بھر دیے ہیں۔

ہاتھوں کو جوڑتی ہوں میں یا شاہِ بحر و بر   شفقت کی اُسکے حال پہ ہر دم رہے نظر

مجھ فاقہ کش غریب کا پیارا ہے یہ پسر   رونے سے اسکے ہوتا ہے ٹکڑے مرا جگر

حیدرؑ سے پوچھیے مری عسرت کے حال کو

کس کس دُکھوں سے پالا ہے اِس نونہال کو

اشک اُسکے جتنے ٹپکے ہیں یا شاہ نیک خو   اُتنا ہی گھٹ گیا ہو مرے جسم کا لہو

روئے ہیں پھوٹ پھوٹ کے یہ میرے روبرو   تر ہو گیا ہے آنسوؤں سے چاند سا گلو

دیکھا نہ تھا یہ میں نے جو حال اسکا آج ہے

حضرت تو جانتے ہیں کہ نازک مزاج ہے

شفقت سے آج آپ نے چومے حسن کے لب   بوسہ لیا نہ اُنکے لبوں کا یہ کیا سبب

میں سچ کہوں یہ سُن کے مجھے بھی ہوا عجب   رتبے میں دونوں ایک ہیں یا سرورِ عرب

اُسکو جو ہو خوشی تو دل اُسکا بھی شاد ہو

چھوٹے سے چاہیے کہ محبت زیادہ ہو

دیکھو شکوہ ہے مگر تلخی نام کو نہیں اور یہ حسن بیان و بلاغت ادا کی آخری منزلیں ہیں۔ شکوے سے بڑھ کے گلے پر اتر آتی ہیں مگر حسین پر ٹال کے،

آپ انکے ناز اُٹھاتے ہیں یا شاہ بحروبر [۴۴] پھر کس سے روٹھیں آپ سے روٹھیں نہ یہ اگر
اکثر انھیں چڑھایا ہی حضرت نے دوش پر گیسو دیے ہیں ننھے سے ہاتھوں میں بیشتر
روٹھے تھے یہ، سو قدموں پہ سر دھرنے آئے ہیں
منھ کے نہ چوٹے منھ کا گلا کرنے آئے ہیں

یہ کہہ کے پھر حسینؑ سے بولیں بچشم تر [۴۵] لو جا کے اپنی کے قدم پر جھکا دو سر
آئے حسین ہاتھ جو ننھے سے جوڑ کر سب بے اختیار رونے لگے سید البشر
رہ رہ کے دیکھتے تھے علی و بتول کو
نزدیک تھا قلق سے غش آئے رسول کو

تھی آنسوؤں سے ریش مبارک تمام نم [۴۶] فرط بکا سے خاک پہ جھکتے تھے دمبدم
گاہے ستوں سے لگ کے ہوئے راستہ گاہ خم ہر لحظہ اضطراب زیادہ تھا صبر کم
ہو سکتا تھا نہ ضبط شہ مشرقین سے
روتے تھے بار بار لپٹ کر حسین سے

انیس نے عجب منظر پیش کیا ہے، ایک بوڑھا شخص بے اختیار رو رہا ہے اور ایک بچہ اُس کو سمجھاتا اور رونے سے باز رکھنا چاہتا ہے۔

شبیر رو کے کہتے تھے نانا نہ روئیے [۴۷] روئینگے اب نہ ہم شہ والا نہ روئیے
ہلنے لگے گا عرش معلے نہ روئیے پھٹتا ہے اب ہمارا کلیجا نہ روئیے
سو بار دن میں ہم تو منھ اشکوں سے دھوتے ہیں
حضرت ہمارے رونے پہ کا ہے کو روتے ہیں

جہاں تک آرٹ کا تعلق تھا وہ حصہ ختم ہوگیا اور یہیں پر یہ تبصرہ بھی ختم ہے۔ انیس کے مرثیوں میں یہ مرثیہ بہت مختصر ہے، اُنکے شاہکاروں میں بھی اسکا شمار نہیں ہے مگر آپ نے دیکھا کہ اس باکمال نے شاعری کے کیسے کیسے معجزے دکھلائے ہیں۔ اس مرثیے کی زبان پر میر انیس کو خود بھی ناز تھا چنانچہ مقطع میں فرماتے ہیں۔

(۴)

حق ہے سنا نہیں کبھی اس حسن کا بیان ۸۵ گویا کہ یہ غلیق کی ہے سربسر زبان
سچ ہے کہ اس زباں کو کوئی جانتا نہیں
جو جانتا ہے اور کو وہ مانتا نہیں

مگر میری ناقص رائے میں زبان سے زیادہ مستحق ستایش اس مرثیے میں تخئیل کی شگرف کاری ہے۔

گنجِ پنہان

نورجہان اور زیب النسار کا اُردو کلام

نورجہان

سید فرزند احمد مرحوم بلگرامی، صاحب تذکرہ "جلوہ خضر" کو شہنشاہ جہانگیر کی چاہتی بیگم مہر النسار المعروف بہ نورجہاں کے دو اُردو شعر نہ معلوم کہاں سے دستیاب ہوگئے ہیں جو موصوف نے اپنی تصنیف مذکور میں نقل کیے ہیں اشعار حسب ذیل ہیں ؎

دیں جگہ زخمِ جفا کو دلِ صد چاک میں ہم — دیکھیں گر کچھ بھی وفا اُس بُتِ بیباک میں ہم

نقشِ پا کی طرح اے راحتِ جانِ عاشق — تیرے قدموں سے جُدا ہو کے ملے خاک میں ہم

اُردو کی ابتدا اسکے دور اول کی اکھڑی اکھڑی زبان، اور پھر مرقومہ بالا اشعار میں زبان کا نکھار اور سُتھرا پن، ہم کو اشتباہ میں ڈالتا ہے، نورجہاں کا فارسی کلام ملتا ہے لیکن اسکا اُردو میں شعر کہنا نہ ثابت ہوتا ہے نہ "تذکرہ جلوہ خضر" کے سوا اسکا کوئی اردو شعر اہل نظر کی نظر سے گزرا ہے

زیب النسار مخفی

شہنشاہ اورنگ زیب کی دختر شہزادی زیب النسا بیگم مخفی کی فارسی غزلیں معاصر مورخین اور تذکرہ نگاروں کی تصانیف میں پائی جاتی ہیں اور اسکا اردو میں شعر کہنا بھی مشہور فرانسیسی وقائع نویس موسیو تاسی کے تذکرہ سے ثابت ہوتا ہے۔ تاسی لکھتا ہے:۔

"میں نے زیب النسار کی اُردو نظمیں دیکھی اور پڑھی ہیں"[1]

---

[1] مغل اور اردو:۔ مصنفہ نواب سید نصیر حسین خان خیال مطبوعہ شائق احمد عثمانی اینڈ سنز۔ پبلشرز مطبوعہ عصر جدید پریس کلکتہ ۱۹۳۲ء۔

مصنفِ "تذکرہ جلوہ خضر" نے حسب ذیل تین شعر مخفی سے منسوب کیے ہیں اور تحریر کیا ہے :-

"ایک پُرانی بیاض میں شہزادی کے اُردو شعر ہماری نظر سے گزرے ہیں۔"

کہا جاتا ہے کہ شہزادی کا زیادہ تر کلام تلف ہو گیا۔ ان اشعار کے علاوہ مخفی کا کوئی اُردو شعر کہیں نہیں ملتا ؎

جُدا ہو مجھ سے مرا یار، یہ خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

آ کر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے
خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے

رامائن کے فارسی تراجم

(بقلم مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل، پروفیسر ادب فارسی و اردو ہندو یونیورسٹی بنارس)

(۱) از علامہ فیضی

رامائن میں اگرچہ فخر ہند سری رام چندر جی و سیتا جی وغیرہ کے حالات مندرج ہیں تاہم اہل ہنود کی نگاہ میں اس کی جو قدر و منزلت ہے وہ بہت ہی کم کتب کو نصیب ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندو اس کو پڑھنا پڑھانا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ القصہ اسی اہمیت کا ثمرہ ہے کہ اسکے مختلف تراجم دنیا کی مشہور زبانوں میں ہو چکے ہیں اور ان تراجم کی بدولت اس کی کم و بیش عزت اُن لوگوں کی نگاہوں میں بھی ہو گئی ہے جو اس مایۂ ناز کتاب کو اسکی اصل زبان سنسکرت میں پڑھنے سے معذور رہیں۔

اکبری عہد میں جبکہ انواع و اقسام کی سنسکرت کتب کے ترجمے فارسی میں ہوئے تھے اسوقت رامائن نے بھی فارسی جامہ زیب تن کیا تھا چنانچہ سنہ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں جب مہابھارت کا ترجمہ پایۂ اختتام کو پہونچا تھا اسکے کچھ عرصہ بعد اکبر نے سنہ ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں ملا عبد القادر بدادنی کو رامائن کے ترجمہ کے لیے حکم دیا تھا اور جو علماء کرام مہابھارت کے ترجمہ میں شریک تھے وہ بھی اس کار خیر میں لگا دیے گئے یہانتک کہ سنہ ۹۹۷ھ میں ترجمہ کی تکمیل ہوئی اور وہ شاہی کتب خانہ کے زیب و زینت کا باعث ہوا تھا۔[1]

یہ اصل نسخہ یا اس نسخہ کی کوئی دیگر نقل کہیں محفوظ ہے یا نہیں اس امر کی بابت یقینی طور پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں عرصہ ہوا کہ 'ندوۃ العلماء' لکھنؤ کے کتب خانہ میں 'رامائن فیضی' نامی ایک قلمی نسخہ میری نظر سے گذرا تھا جس کے کاتب و سنہ کتابت کے بارہ میں تحریر ہے:-

---

[1] منتخب التواریخ از بدادنی مطبوعہ کلکتہ جلد ۲ ص ۳۳۶ و ص ۳۶۶ و آئین اکبری از مرزا ابو الفضل مطبوعہ منشی نولکشور پریس لکھنؤ ص ۱۰۴

"گوپی ناتھ ولد ہردیو رام بیکل کھتری سیالکوٹ در سنہ ۱۰۵۲ھ[۱] تحریر نمودہ ۔"

یہ نسخہ کل ۲۵۵ صفحات پر مشتمل ہے ہر ایک صفحہ میں تقریباً ۱۶ سطریں ہیں۔ پورا ترجمہ نثر میں ہے صرف کہیں کہیں نظم کے اجزا رہیں۔ میرے نزدیک تو یہ کتاب اس نسخہ کی نقل نہیں جو کہ اکبر کے حکم سے تیار کیا گیا تھا بلکہ یہ تو علامہ فیضی کے ذاتی جدوجہد کا ثمرہ معلوم ہوتا ہے۔ خیر جو ہو سو ہو۔ اب اس نسخہ میں سے ایک اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے :-

جنگ لشکر راون با فوج ظفر موج سری رام چند و شکست خوردن و کشتہ شدن فوج راون بدکردار

سحرگاہان کہ شاہنشاہ خاور لوائے ظفر در عرصۂ مشرق برافراخت خبر رفتن ہنومان و آوردن گیاہ سنجیون و صحیح البدن و تندرست شدن بہادران فوج سری رام چند مفصل و مشرح براون ظاہر شد بسیار غمگین گردیدہ لختے از غایت فکر نقش دیوار حیرت ماند۔ بعد از ساعتے دلیران فوج خود را آمادۂ پیکار نمودہ بدیں قسم ترتیب داد۔

(۲) رامائن مسیحی

یہ کتاب ملا مسیح کی تصنیف ہے جو کرانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے اُنھوں نے اس کتاب کو عہد جہانگیر میں تصنیف کیا تھا۔ مکمل نسخہ منشی نولکشور صاحب کے مطبع لکھنؤ سے سنہ ۱۹۰۶ء میں شایع ہو چکا ہے۔ نمونہ کے طور پر مختلف مواقع کے اقتباسات ذیل میں دیے جاتے ہیں :-

(۱) آغاز داستان رام و سیتا

شکر گفتار ایں شیریں فسانہ — بدیں آہنگ بسرود ایں ترانہ
کہ رائے بود اندر کشور ہند — بزیر خاتمش بنگالہ تا سند

---

[۱] مطابق سنہ ۱۶۴۲ء

بشہر اودھ نامش راجہ جسرت ‏— زِ بختش آسماں می برد حسرت

زعدلش آتش و پنبہ شدہ خویش ‏— برادر خواندہ خواندی گرگ را میش

بدورش بسکہ گیتی بود خرم ‏— نماندہ نام غم جز در سپرغم

ز اقبالش جہاں را عید نوروز ‏— بہ بزمِ رزم چوں خورشید فیروز

بفرمانش بہ بستاں کردہ بلبل ‏— تغیرے نام نافرمانی از گل

کشیدہ تیغ تیزش خنجرِ مہر ‏— عقیم از فتنہ گشتہ مادرِ دہر

ز دستِ آرزو بخشش در آفاق ‏— شکستہ قدرِ زر چوں رنگِ عشاق

(ب) مصلحت کردن راجہ جسرت با وزیران بجہت جلوس رام بر تخت شاہی

چو جسرت در اودھ بنشست دلشاد ‏— بجا آورد شکرِ حق ز اولاد

بخلوت مصلحت جست از وزیراں ‏— نہاں پرسید کاے روشن ضمیراں

مرا عمر آخر آمد گشتہ ام پیر ‏— صلاحِ دولت اکنوں چیست تدبیر

ز دستِ پیر ناید کارِ شاہی ‏— جواں خواہ است فرِّ کجکلاہی

پسر رام من جوان و شیر مردست ‏— ز دستش آنچہ آمد کس نکردست

ہماں بہتر کہ بر تختش نشانم ‏— بدستِ خود بتاجش زر فشانم

روم پس در بہ بندم بر رُخِ غیر ‏— پرستش گر شوم در گوشۂ دیر

برائے رائے ہر کس آفریں کرد ‏— منجم آمد و ساعت گزیں کرد

مقرر شد کہ فردا رام بر تخت ‏— ز دستِ رائے یابد افسر و بخت

بہ وسلے کار فرما رائے فرمود ‏— کہ اسبابِ جلوسش ساز فرمود

(ج) پند دادن کنبکرن راون را و اعراض شدن راون از و

زمیں بوسید و گفت اے شاہ دیواں — دل من ماندہ است امروز حیراں

کہ از خوابم چرا بیدار کردی — خلاف عادتم آزار کردی

مگر کارے در افتادہ بدشمن — کہ شوراندی چنیاں خوش خواب من

بگفتا رام لنکا را قتل کرد — سراسر شہر دیواں را خلل کرد

ز دیواں جز دو کس پیدا اثر نیست — ترا اے بیخبر اصلا خبر نیست

ز ضرب تیغ آں گرد بلا جو — نماندہ زندہ فردے جز من و تو

بگفتا رام را با تو چہ کین ست — بگفتا عشق سیتا در کمین ست

بگفتا بہر یک زن گرچہ حور ست — خرابی جہاں دیدن قصور ست

بطفلاں پند باید دادن از جاں — بتو حیف ست پند اے پیر ناداں

زیادہ گشتہ بدمست دید رسلے — بکن مے ترک اے خودبین خودرائے

اس رامائن کے متعلق اس امر کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مطبوعہ نسخہ کے سوا چند دیگر قلمی نسخے بھی میری نظر سے گذرے ہیں اور ان سبھوں کی عبارتوں میں کہیں کہیں فرق معلوم ہوا ہے۔

(۳) از چندر مان بیدل

اس نسخہ کے مصنف غالبا مدہ پورنامی کسی مقام کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب عالمگیری عہد میں تصنیف کی تھی۔ یہ کتاب بھی منشی نولکشور صاحب کے مطبع لکھنؤ سے ۱۸۷۵ء میں شایع ہو چکی ہے اور اسکا نام 'نرگستان' 'سنبلستان' بھی ہے۔

صاحب کتاب کی تحریر سے ایسا نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ نے پہلے فارسی نثر میں رامائن لکھی تھی اسکے بعد اسکو نظم کے قالب میں ڈھالا تھا چنانچہ منظوم رامائن میں مندرج ہے:—

اگرچہ پیش ازیں ایں داستانے　　بہ نثر آوردہ ام دریک زمانے
کنوں خواہم کہ در نظم آورم باز　　شوم ایں داستانے پاک ممتاز

جناب بیدل کی منثور رامائن کا سُراغ کہیں نہیں لگتا لہذا صرف منظوم تصنیف کے کچھ اشعار بطور نمونہ ہدیہ ناظرین ہیں:—

آغاز بال کانڈ

بیا اے بلبل طبعم بہ گفتار　　بکش یک نغمۂ زاں شاہ دلدار
کہ از نامش جہاں را شادمانی ست　　ہمہ عالم از و در کامرانی ست
معطر چشمۂ باغ جناں راست　　رہائی بخش مر اہل جہاں راست
جہاں را ذکر او ابر بہار ست　　نہالِ عارفاں را جوئبار ست
بذکر رام شو مشغول امروز　　برآ بیروں ز دام نفس جانسوز
بگفتا گوش کن از من ترانہ　　کہ گویم صاف زاں شاہِ یگانہ
شہنشاہِ جہاں دوربتر نیتا　　بدے جسرت بخوبی دُرِّ یکتا
اجودھیا بود دیگر پایۂ تختش　　بدے اندر جہاں بیدار بختش
بلند اقبال والا تا جدا رے　　برا ز جمشید و کسرے کامگارے
فلک بودے مدام اندر مرادش　　ہمیشہ نقش بر نقش او فتادش
بُدے یکتا گہر در بحر شاہی　　فروزاں بر سرش ظل الٰہی
سہ خاتوں داشت آں شاہِ جہانبان　　بذات پاک کوشلیا یکے زاں
سومترا بود دیگر کیکئی ہم　　بخوبی مثل اینان در جہاں کم

(۴) از لالہ امر سنگھ

صاحب قوم سکسینہ کالیستھ تھے اُنھوں نے سمبت ۱۸۴۲ بکرمی (۱۷۸۵ء) میں فارسی نثر میں

راماین لکھی تھی۔ چنانچہ انکی گرانمایہ تصنیف جناب پنڈت مادھو پرشاد صاحب کی سعی و کوشش سے مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۸۷۰ء میں اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ نمونہ کے طور پر تھوڑی سی عبارت نقل کی جارہی ہے :—

دانایان پیشیں چنیں گفتہ اند کہ در شہر پراگ از ملحق شدن گنگا و جمنا و سرستی تربینی نام تیرتھے ست ہر کس در عمر خود یک مرتبہ غسل نماید عذاب ہائے جنم[51] آنرا برود و آنکہ بنام ماہ مکر غسل نماید مراتب او چہ تواں گفت از ارتھ[52] و کام[53] و موچھ[54] و دھرم[55] ہمہ حاصل شود دستوریست قدیم کہ در ہر ماہ مکر مسمی ازدی وحدی خلایق بسیار جمع می آیند و تمام ماہ مکر ہر کدام بخانہ خود ہا می روند اتفاقاً در سالے بماہ مکر مردماں فراہم آمدند جاک بلک کہ نام رکھیشر کہ عابد مرتاض ست بدانجا رسید بہردواج وغیرہ رکھیسران بقدم بوسی او مستفید شدند لوازم مہمانداری بجا آوردند۔

(ماخوذ از بال کانڈ)

(۵) ازلالہ امانت رلے

انھوں نے پہلے شریمد بھاگوت کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ اسکی مقبولیت کے بعد راماین کو نظم میں لکھا تھا جسکا سنہ تصنیف سمبت ۱۹۱۲[56] بکرمی ہے، یہ راماین بھی منشی نولکشور صاحب کے ہی مطبع لکھنؤ سے ۱۸۷۲ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اس مصنف نے بعض امور کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے اسکا اندازہ نمونہ جات مندرجہ ذیل سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے :—

(۱) آغاز کتاب رامائن بال کانڈ سری گنیش آئیمہ

فصاحت بیانانِ ہندی زباں — کنند ایں چنیں شرح ایں داستاں

کہ در نسل راجہ من کامگار — بسے راجہ شد زینتِ روزگار

[51] ولادت۔ پیدایش۔ [52] مال۔ [53] آسودگی۔ اطمینان۔ [54] نجات۔ [55] دین۔ ملت۔ [56] ۱۸۵۴ء۔

همه صاحب جمله روے زمیں — کشیده جہاں زیر خط نگیں
زبردست و فیاض عالی همم — چو بحر و چو ابر سخاوت علم
ازیں ها یکے او سگر نام بود — چو خور جود او در جہاں عام بود
بفرمان او خندق بحر شور — بگرد زمیں کنده از پاے زور
پسرها ازو شد بخلق آشکار — بتعداد صفر رقم شش هزار
ز اولاد او چھاک بود آں بزرگ — بفطرت مهین و بدانش سترگ

(ب) نصیحت کردن مالونت نامی پیر خردمند و دور اندیش راون بدتورکا، آگاهان تجربه کار و قبول نکردن راون موعظت را و خجل گردیدن

رقم ساز کیفیت ایں کتاب — سخن ها کند ایں چنیں انتخاب
که راون چو با مردم خویشتن — بگفت از پے جنگ کردن سخن
با و مالونت عقیدت گر سلے — که ممتاز بود از ره عقل و رسلے
برسم جہاندیده مردم سخن — چنیں ابتدا کرد در انجمن
که شاہے که باشد عدالت گزیں — علوم خرد باشدش دلنشیں
در آفاق عالم بود کامراں — ظفریاب باشد بملک جہاں
صف دشمناں را بقید آورد — بجنگ اجل هیچو صد آورد
کند وقت جنگ از پے جنگ میل — برد رخت دشمن بغارت چو سیل
کند صلح در وقت صلح آشکار — ز سیلاب آفت بود بر کنار
بود هر که از زور بازوے کم — نباید زدش از پے جنگ دم

(ج) شنیدن راون احوال کشتہ شدن کنبہ کرن

دلیرانِ میدانِ رزمِ سخن — برانگیختند اسپ عزمِ سخن
کہ از کشتہ گردیدنِ کنبہ کرن — بخوناب غلطیدن کنبہ کرن
خبر یافت راون ز اہلِ خبر — دلش غوطہ با زد بخونِ جگر
بیفتاد چوں اشک بر خاک راہ — کشید از دل خویش چوں شمع آہ
نماندش ز سر ہوش و دستار ہم — نمش شد زباں سوخت گفتار ہم
پسرہائے او چوں بدیدند حال — کہ ایناں پسر شد شکار ملال
ہمہ گریہ کردند بے اختیار — ہمہ رفت از خویشتن اشکبار
ترانیک بسیار بیتاب شد — دل تر سرا از الم آب شد

ان تمام نسخوں کے سوا چند دیگر نسخوں کے بارے میں بھی کچھ پتہ چلا ہے۔ مگر بلا تحقیق ان کے بارہ میں کچھ لکھنا مناسب نہیں۔ ہاں اب اخیر میں یہ کہدینا بھی بیجا نہ ہوگا کہ راماین کے مذکورہ بالا نسخوں میں سے کوئی نسخہ لفظی ترجمہ کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ حق تو یہ ہے کہ جو حالات سنسکرت یا ہندی راماینوں میں مرقوم ہیں انھیں کو فارسی نثر یا نظم کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے جس سے کہ فارسی داں اصحاب بخوبی مستفید ہو سکتے ہیں۔

ضرورت رشتہ؟

ایک تقریباً ۴۵ سالہ سرکاری ملازم سید عالی نسب مسلمان کیلیے جسکی آمدنی تخمیناً ماہانہ ۱۵۰ روپیہ ہوار ہے بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ لڑکی کی عمر ۲۰ سال سے کم نہو۔ لاولد تعلیم یافتہ صاحب جائداد بیوہ کو ترجیح دیجاویگی۔ مراسلت راز رہیگی۔ درخواستیں بنام (ب) بذریعہ منیجر صاحب رسالہ خیابان وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ آنا چاہیے۔

غزل

نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل مینائی

خنجر کمر میں - ہاتھ میں پیکاں لیے ہوے
آئے ہیں دردِ دل کا وہ درماں لیے ہوے

دل میں خیال کوچۂ جاناں لیے ہوے
صحرا کو میں چلا ہوں گلستاں لیے ہوے

کانٹوں کے نذر ہو گیا وحشت میں پیرہن
دامن ہے کوئی - کوئی گریباں لیے ہوے

آتا ہے ذرہ ذرہ نظر کوے یار کا
پہلو میں آفتاب درخشاں لیے ہوے

صیاد بنکے آپ چلے ہیں کدھر یہ آج
شانے پہ دامِ زلف پریشاں لیے ہوے

آئینے کی ہے آج طلب بزمِ یار میں
جاتا ہوں میں بھی دیدۂ حیراں لیے ہوے

عشاق حشر میں ہیں بجاے خطِ عمل
ہاتھوں میں چاک چاک گریباں لیے ہوے

بسمل تمھارے چلتے ہیں کس بانکپن کے ساتھ
گردن پہ تیغِ ناز کا احساں لیے ہوے

دیوانے تیرے مرغِ جنوں کے شکار کو
نکلے ہیں تار تار گریباں لیے ہوے

مے سے عجیب شان ہے مینا کی ساقیا
گویا ہیں خضر چشمۂ حیواں لیے ہوے

اُس چشمِ سرمگیں میں ہے کیا شوخیِ نگاہ
ابرِ سیہ ہے برقِ درخشاں لیے ہوے

پھولوں کا کیا حساب ہے جوشِ بہار سے
ایک ایک برگِ گُل ہے گلستاں لیے ہوے

سُرخی نہیں شفق کی یہ پھرتا ہے آسماں
گردن پہ اپنے خونِ شہیداں لیے ہوے

اک ہاتھ اُنکا مُصحف ہے اک میرے ہاتھ میں
عہدِ وفا وہ کرتے ہیں قرآں لیے ہوے

مقبولیت یہ دادِ خدا ہے کہ اہلِ ذوق
ہاتھوں میں ہیں جلیل کا دیواں لیے ہوے

طبقۂ نسواں میں تحریکِ تجرّد

(بقلم بانوے عصمت آمنہ خاتون صاحبہ عفت میونسپل کمشنر مظفر نگر)

عورتوں میں شادی سے اجتناب کی تحریک سرزمین یورپ پر اپنی داغ بیل ڈالتی ہوئی کرۂ ارض پر محیط نہ ہونے کے لیے سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ صنف نازک میں قانون قدرت سے انحراف کا خیال کس نے پیدا کیا؟ اسکی تاریخ کے آغاز کیلیے ہمکو صدیوں پیچھے ہٹ کر مسیحیت کے نبی سنٹ پالؔ[1] کے عہد تک پہونچنا پڑیگا۔ اور اسکی تعلیم پر ایک غائر نظر ڈالنا پڑیگی۔ ازدواجی زندگی کے متعلق پال کے بھی عجیب و غریب خیالات ہیں۔ وہ اگر شادی کی حمایت کرتا ہے تو بے اعتدالیوں سے تحفظ کے لیے۔ اسکے علاوہ وہ کوئی اور نفع شادی میں نہیں دیکھتا۔ بلکہ شادی سے تنفر کرنے والی عورتوں کو اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت باوقعت متصور کرتا ہے۔ اور اسکی تائید میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ ایک مجردہ بہ نسبت ایک شادی شدہ عورت کے زیادہ تقدس و تعبد کی زندگی گزار سکتی ہے۔

وہ کہتا ہے کہ ایک دوشیزہ کا دل عبادت گاہ ہوتا ہے اسکا جسم و روح دنیاوی آلودگیوں سے پاک رہتے ہیں۔ وہ ہر وقت خدا سے لو لگائے رہتی ہے۔ لیکن ایک شوہر دار عورت دنیاوی زندگی کے علائق میں مبتلا رہتی ہے اور اپنی آرائش اور رفیق زندگی کی خوشنودی اپنا نصب العین سمجھتی ہے۔ غالباً اسی تعلیم کا اثر ہے کہ یورپ کے گوشہ گوشہ میں تجرد شعار عورتیں نمایاں ہیں۔ یوروپین ممالک کی مردم شماری کے اعداد و شمار میں ایسی عورتوں کی معقول تعداد ملیگی۔ یہ تعداد تعلیم کی فراوانی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے[2]۔ پال کی تعلیم کا مسموم اثر تو اس تحریک کا مذہبی پہلو تھا لیکن مذہب سے قطع نظر کرکے اور یقیناً اسوجہ سے قطع نظر کرکے کہ مادیت پرست یورپ کی نگاہ میں مذہب کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ وقعت۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد تعلیم اس تحریک کی نشوونما کا باعث ہو رہی ہے۔

تعلیم کی پہلی نعمت انسان کو یہ ملتی ہے کہ اسکا دماغ جہالت کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جاتا ہے

---

[1] St. Paul مسیحیت کا مشہور نبی۔ [2] فرانس میں ایسی عورتوں کی کثرت ہے۔

اور پھر ایکبار آزاد ہونے کے بعد وہ بندشوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ آزاد تعلیم سے آراستہ عورتیں جب ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس کرتی ہیں تو انکا دل کانپ جاتا ہے اور وہ جذبات کشی کو شادی اور اسکی وجہ سے کنیزی پر ترجیح دیتی ہیں۔

ضبط تولید بھی اس تحریک کا ایک شاخسانہ ہے۔ جیسا کہ ایک مبصر نسائیات نے مشاہدہ کیا ہے "اگر اس تحریک کے انسداد کی عملی تدابیر نہ اختیار کی گئیں تو وہ دن بھی دور نہیں جب یہ نسل انسانی کے لیے ایک مستقل خطرہ ہو جائے گی"۔ ڈاکٹر آٹو نیلڈور[1]۔ ڈی ڈی کہتا ہے :-

"ازدواجی زندگی ہی عورت میں اخلاق کی تکمیل کرتی ہے اور وہ اسمیں صداقت۔ صبر، تحمل، استقلال ایثار و محبت کو پختہ کرتی ہے۔ ازدواجی زندگی ہی وہ زندگی ہے جو حقیقی معنے میں مسرت کی زندگی کہے جانے کی مستحق ہے اور اسمیں پاکباز رہنے کے وہ امکانات ہیں جو دنیا بھر کے حلقۂ راہبین میں نہیں"۔

پال کی تعلیم قانون قدرت کے سراسر منافی اور زندگی کے عملی پہلو کو نظر انداز کرتی ہے خود حضرت مسیح نے رہبانیت کی کہیں بھی ترغیب نہیں دی۔ پھر اگر ایک غلط تعبیر سے ہزاروں انسان گمراہ ہو کر اپنی زندگی کا صحیح استعمال نہ کر سکیں تو باعث عبرت نہیں تو اور کیا ہے۔ اطالیہ کا مایۂ ناز مدبر اور ڈکٹیٹر مسولنی[2] لکھتا ہے :-

"آج عورتیں اور مرد افزائش نسل کے فرائض سے کنارہ کشی کر رہے ہیں لیکن انکو یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کی صفحات تاریخ پر کوئی متمدن قوم اپنے تہذیب و تمدن کی یادگار نہیں چھوڑ سکتی اگر وہ من حیث القوم اپنی بنیاد کو مستحکم بنانے اور اپنی نسل کے بڑھانے کے فرائض سے نا آشنا رہے"۔

درحقیقت ایک منظم ازدواجی زندگی قومی حیات کا دیباچہ ہو سکتی ہے۔ اگر ہماری ازدواجی زندگی کے نظام کا شیرازہ ابتر ہو گا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمارے قومی نظام کے اجزا کو

---

[1] Dr. Otto Pfleiderer D.D.

[2] Mussolini

منتشر ہونے سے بچا نہ سکیگی وہ قوم جسکی عورتیں مائیں بننے اور مادرانہ ذمہ داریوں کے بار کو اپنے سر لینے سے احتراز کرتی ہوں صفحۂ ہستی سے معدوم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ دنیا کی نامور قوموں کی تعمیر رفامردوں اور مصلحین نے نہیں کی ہے۔ بلکہ اُنکی حقیقی معمار وہ مائیں ہیں جو پاکبازی سے مائیں بنیں اور جنھوں نے ایسی اولاد پیدا کی جسکی سرشت میں پاکبازی تھی اور وہ زیور اخلاق سے آراستہ تھیں۔ اسی پر تو مسولینی چلکر کہتا ہے:—

"وہ مرد اور عورتیں جو باپ اور ماں بنکر افزائش نسل نہیں کرنا چاہتے وہ قابل صد ہزار نفرین ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس قماش کی عورت ہوگی۔ جو اولاد پیدا کرنے سے تنفر کرے۔ ہمکو اُن نیک طینت بیبیوں کے پاک جذبات کا اندازہ ہے جو صرف اولاد کی متمنی رہتی ہیں بلکہ اولاد کے دنیا کے باغ میں پھلنے پھولنے کیلیے ہزار دل منتیں مرادیں کرتی ہیں۔ جس طرح آج سے صدیوں پہلے اپنے کثیر عیال پر ایک روم ماں کی مسرت و افتخار ضرب المثل تھا۔ اسی طرح آج بھی ایک ماں کا اپنے بچوں کے جُھرمٹ میں بیٹھکر کہنا کہ "یہ میرے لعل ہیں" وجد انگیز ہے"

جدید اطالیہ کا معمار اور بانی نہ صرف ازدواجی زندگی کا حامی ہے بلکہ وہ اکثر اولاد پیدا کرنے کا بھی زبردست مؤید ہے اور وہ استدلال کرتا ہے کہ ضبط تولید کا اقتصادی پہلو صرف اس حد تک ضرور حقیقت رکھتا ہے کہ اگر آپ کئی بچوں کی صحیح اصول پر تربیت و تعلیم کی استطاعت نہیں رکھتے تو صرف ایک اولاد پیدا کیجیے۔ اور اسکی بہترین تربیت کرکے اسکی زندگی کی بہاریں دیکھیے۔ قوم کے افلاس کا رونا تو آج نیا نہیں۔ لیکن افلاس سے دنیا کی آبادی میں کوئی تخفیف نہیں ہو سکتی۔ ایک صدی گزری ہوگی جب مالتھس[1] نے اپنے نظریۂ آبادی کی رو سے مشاہدہ کیا تھا کہ غذا کی پیداوار اور آبادی کی ترقی میں کوئی تناسب باقی نہیں رہ سکتا اور آبادی ہمیشہ غذا کی پیداوار سے زیادہ ترقی کریگی۔ ہمارے مشاہدات

---

[1] مالتھس Malthus اپنے نظریۂ آبادی Theor of Po[illegible] کی وجہ سے عالمگیر شہرت رکھتا ہے۔ یہ نظریہ اب مقبول نہیں ہے۔

و تجربات نے مالتھس کے نظریہ کو بھی مسترد کر دیا۔ کیونکہ ایک قلی کو بھی آج وہ اقتصادی فوائد حاصل ہیں جو ایک صدی قبل جب مالتھس نے اپنا نظریہ پیش کیا تھا۔ اسکے خواب و خیال میں بھی نہیں تھے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ کم اولادیں پیدا کرو۔ لیکن یہ تو نہ مستحسن معلوم ہوتا ہے نہ اصولاً صحیح ہے بلکہ اس سے ہماری اخلاقی خامی نمایاں ہوتی ہے۔ کئی اولادوں میں ہماری محبت سب کے ساتھ یکساں رہتی ہے۔ اور ہم مساوات کے خوگر ہو جاتے ہیں لیکن ایک اولاد کی صورت میں ہماری پدرانہ و مادرانہ محبت و شفقت پیمانۂ اعتدال سے چھلک کر ہمکو وارفتہ کر دیتی ہے۔ اور اس طرح صرف یہی نہیں ہوتا کہ ہم صرف ایک اولاد کی تربیت سے قاصر رہتے ہیں بلکہ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ کے لاڈ و پیار سے اولاد غارت جاتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:۔

"چھوٹے چھوٹے بچوں کی ذرا ذرا سی بات پر دلفریب لڑائی انکو زندگی کی جنگ کیلیے مسلح کر دیتی ہے"

مسولینی نے جو دل خوش کن باتیں کی ہیں وہ اب خواب و خیال ہو گئیں طبقہ نسواں کی موجودہ تحریکات اور نسائیت کے متعلق انکے خیالات و نظریات نے یورپ کو "گھریلو زندگی" کی حقیقی مسرت۔ شان اور اقبال سے محروم کر دیا۔ اس زمانہ میں "کورٹ شپ" عورت اور مرد کی زندگی کا خوشگوار ترین دور ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انکی مسرت کی یہی ابتدا ہے اور یہی انتہا بھی جہاں دونوں مقدس باپ (پادری) کے سامنے سر تسلیم خم کرکے کھڑے ہوے اور "ایجاب و قبول" کی رسم ادا ہوئی وہاں انکی زندگی بھر کی خوشیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ بہت زمانہ نہیں گزرتا کہ وہ عدالت طلاق میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور زندگی کا ایک عبرت انگیز منظر پیش کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکیگا کہ طبقہ نسواں کی موجودہ تحریکات نے سچی "ہوم لائف" یا گھریلو زندگی کی کس قدر بیخ کنی کی ہے۔ اور مغرب کی کم و بیش ایک ثلث شادیاں عدالت طلاق میں جاکر ختم ہو جاتی ہیں۔

مسولینی نے جس گھریلو زندگی کا خواب دیکھا ہے وہ موجودہ تحریکات نسواں کی موجودگی میں ممکن نہیں۔ خود اُسی کے قول کے مطابق:۔

"کورٹ شپ کی شادی مادرانہ و پدرانہ ذمہ داریوں سے بچنے کا پیش خیمہ ہے۔ اور
وہ ایک مسرت بخش رشتے کے نام سے آخر میں زندگی کی ایک حیا سوز منزل تک پہنچا دیتی ہے"
یہ غلط ہے کہ ازدواجی زندگی ایک ایسا فرض عائد کرتی ہے جسکا ثمر کچھ نہیں۔ شادی ہی ہم میں استغنا پیدا کرتی ہے۔ دنیا کے مصائب برداشت کرنے کیلیے ہمارے قدموں کو آہنی بنا دیتی ہے اور شادی ہی ہمکو حقیقی اور ابدی مسرت کی شاہ راہ پر لگا دیتی ہے۔

نوائے آرزو

(حضرت آرزو لکھنوی کا تازہ کلام)

اور تغیرات رُخ غور سے دیکھ یا نہ دیکھ — دیکھنا ہو جو اپنا حال آئینۂ زمانہ دیکھ
شوق کی انتہا کو سوچ کام کی ابتدا نہ دیکھ — سانس کا اعتبار کیا بہتی ہوئی ہوا نہ دیکھ
رُک کے لیا جو دم تو پھر خام ہے شوق جستجو — جسکی مدد کا ہو یقیں اُسکا بھی آسرا نہ دیکھ
پردے کے اسطرف ہو تمیں پردے کے اُسطرف ہے دل — میں تجھے دیکھے جاؤنگا تو مجھے دیکھ یا نہ دیکھ
دُکھ میں ہے سُکھ تو سُکھ میں دُکھ نعمت رب ہے جو ملے — آنہ فریب نفس میں دیکھ بھلا بُرا نہ دیکھ
شق نہو جذب غم کے بعد دل وہ کہاں سے لائیگا — کان سے واقعات سُن آنکھ سے ماجرا نہ دیکھ
اسکے جہاز کی عناں باگ نصیب کی کہاں — بھول گیا خدا کو کیا جانب ناخدا نہ دیکھ
علم بھی ہو تو سے نہ کام بگڑیگا دھر کا نظام — ناصیہ کے خطوط میں حال دل اور کا نہ دیکھ
عیب سے بنے دلیل عیب یہ کوئی قاعدہ نہیں — اپنے کو داغ سے بچا دامن پارسا نہ دیکھ
خون تو جذب ہو گیا خاک میں ہے دھرا ابھی کیا — دیکھ سے منظر شفق مقتل کربلا نہ دیکھ

شوق سے وقت جستجو طالب جذب بھی ہے تو
بے غرضی پہ آرزوؔ مسلک شاطرانہ دیکھ

درگا پوجا کے مناظر۔ ایک صدی قبل

(بقلم نواب زادہ ابوالفیض محمد عبدالعلی، ایم اے۔ ایم آر اے ایس۔ ایف آر ایس ایل، آنریری سکریٹری ہسٹاریکل رکارڈز کمیشن و کیپر رکارڈز گورنمنٹ آف انڈیا۔)

بنگال کا درگا پوجا مغربی و جنوبی ہندوستان میں "دسہرہ" کہلاتا ہے بنگال میں درگا پوجا سکون اور خاموشی کے ساتھ منایا جاتا ہے لیکن دیگر اقطاع ہند میں شری رامچندر جی کی فتح لنکا کی مسرت میں یہ ایک فوجی جشن کی شان رکھتا ہے۔ دسہرہ موسم باراں کے خاتمہ پر ہوتا ہے، برسات میں تمام فوجی نقل و حرکت بند رہتی ہے جسکا سبب یہ ہے کہ موسلا دھار بارش میں جل تھل بھر جاتے ہیں اور راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ ازمنہ قدیم میں جبکہ سفر کے وسائل مسدود تھے۔ بارش کے اثرات کا کافی احساس کیا جاتا تھا۔ برسات میں سڑکوں پر دلدل ہو جاتی تھی۔ دریا بڑھ جاتے تھے۔ پل شکستہ ہو جاتے تھے اور فوجیں چھاؤنیوں اور قلعوں میں بھیجدی جاتی تھیں۔ اکثر سپاہ کو صرف موسم برسات کیلیے غیر منظم کر دیا جاتا تھا اور سپاہیوں کو اپنے اپنے گھروں پر اہل و عیال میں موسم بہار صرف کرنے کی اجازت ملجاتی تھی ہندی گیتوں میں ماؤں اور بیویوں کے اُن پاک جذبات کی مصوری کیگئی ہے جو وہ اپنے محبوب کے مضطربانہ انتظار میں ظاہر کرتی تھیں۔ کسی مشہور ہندوستانی مصور نے اپنے ایک شاہکار میں کتنا سچا منظر پیش کیا ہے:—

"ایک دوشیزہ ہمہ تن درہمہ انتظار ہے۔ آسماں پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور پانی گھر اکھڑا ہے۔ اُن کالے کالے بادلوں کے ٹکڑوں میں جو ہوا سے باتیں کرتے ہوئے آسمان پر اُڑتے چلے جاتے ہیں عجیب صنعت سے خط و خال پیدا کرکے حقیقت منتظر کو بے نقاب کیا جاتا ہے اور معشوق کے جلوہ کی جھلک دکھائی جاتی ہے اس مہ جبین کی نگاہوں میں برق جمال کوندتی ہے اور وہ بیتاب ہو کر اپنے دل سے کہتی ہے۔ "آہ! مورپا کس دیس گیو رے"

اس زمانہ میں برسات کی انتہا ہو جاتی تھی۔ مگر بھادوں کے آخری جھالوں

شروع ہو جاتا تھا فوجی مظاہرے اور جائزے ہونے لگتے تھے اور جہاں تک

دسہرہ عہد اکبر ثانی میں

دسہرہ ہندوستان کے ہندوؤں کا اہتمام بالشان

گوشہ گوشہ میں مذہبی انہماک، مسرت و شا

ہے۔ سلاطین مغلیہ نے اسکو خسروانہ اعزاز بخشا تھا۔ اور اس سلسلہ کے آخری

بنفس نفیس دسہرہ کی تقریبات میں شرکت کی تھی۔ سلاطین مغلیہ کے دور

مواقع پر وہ شان و شوکت نہیں رہی تھی جو اکبر و جہانگیر کے عہد میں ہو گی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی زمانہ کے مشہور و معروف فارسی جریدہ "جام[51]

میں ملتا ہے جو دربار دہلی کا ایک منظر پیش کرتا ہے :-

" دسہرہ کے دن امرا و ارکان حکومت دیوان خاص میں مجتمع ہو گئے اتنے میں

شاہی سواری آئی اور اکبر ثانی[52] شاہ عالم کا جگر بند تخت زرنگار[53] پر جلوہ افروز ہوا،

---

[51] جام جہاں نما کا اجرا تقریباً مئی ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے ہوا تھا۔ یہ آٹھ صفحے کا فارسی اخبار تھا۔ یہ ہندوستان میں غالباً سب سے پہلا اخبار ہے اسکی کچھ اشاعات امپیریل ریکارڈز ڈپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا میں تا ہنوز محفوظ ہیں۔ پانچ سال تک تو یہ گورنمنٹ کی سرپرستی میں شایع ہوا کیا کیونکہ سرورق پر شاہی نشان ہوتا تھا۔ اور خبروں کا لب و لہجہ حکمانہ شان رکھتا تھا دوسرے سال یعنی ۱۸۲۳ء میں اسکا اردو ضمیمہ شایع ہونا شروع ہوا۔ جو دل لبھانے والے قصوں اور مزاحیہ خبروں سے پر ہوتا تھا۔ چند ہفتوں کے بعد قصص کے بجائے تاریخ عالمگیری کا اُردو ترجمہ شایع ہونا شروع ہو گیا جام جہاں نما ہی میں ہندوستان کے سب سے پہلے اینگلو انڈین اُردو شاعر **De Caola** کی غزلیں شایع ہوئی ہیں جو خیابان کی جلد اول کی کسی اشاعت میں جگہ پا چکی ہیں۔

[52] اکبر ثانی ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک۔

[53] شاہجہاں کا تخت طاؤس ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ درانی لے جا چکا تھا اس کے بجائے ایک زرنگار تخت تھا جس پر دور آخر کے شاہان مغلیہ جلوس کرتے تھے۔

اہل دربار اپنی اپنی مخصوص جگہ پر زانوے ادب تہ کرکے بیٹھ گئے۔ پھر بادشاہ
نے شاہانہ رسم کے مطابق ایک شکرے کو دست مبارک پر بٹھایا۔ اور دربار
شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے بسر موہن مہتمم طیور خانہ نے ایک پنجرے میں بھری
ہوئی چڑیاں بادشاہ کے سر سے صدقہ کرکے اُڑادیں پھر راجہ کدار ناتھ نے
نذر پیش کی۔ نذر کا روپیہ ممتاز محل[1] اور ولی عہد سلطنت کو بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد
حضرت ظل سبحانی نے غلام دستگیر داروغہ کو تین پارچہ کا خلعت عطا کیا اور دو دو شرفیاں
بسر موہن اور نور محمد شکرے بازوں کو مرحمت کیں۔ چار تیتر مسٹر مٹکاف[2] رزیڈنٹ
کو بھیجے گئے۔ بعدہ داروغہ اصطبل شاہی نے ایک کشتی میں پان اور بتاشے پیش کیے
جس کے صلہ میں ایک اشرفی اسکو اور پچاس روپیہ اسکے ماتحتوں کو انعام ملا"

دسہرہ عہد سلاطین اودھ میں

ذیل کا تذکرہ لکھنؤ دار السلطنت اودھ کے تقریبات دسہرہ کے متعلق ہے :-

"بادشاہ نے رام لیلا بچشم خود ملاحظہ فرمایا اور محظوظ ہوکر سو روپیہ انعام کا دیا۔
اور حکم ہوا کہ کل پھر لیلا ہو۔ دوسرے روز ہزارہا تماشائی۔ گومتی کے اُس پار
مبارک محل[3] کے سامنے جمع ہوگئے۔ امرا و اعیان سلطنت اپنے مراتب کے موافق
صف بستہ باادب کھڑے ہوگئے۔ دوسری طرف گھوڑے اور ہاتھی جن پر مرصع
زین اور گنگا جمنی اماری اور بیش بہا زرنگار جھولے پڑے ہوئے تھے کھڑے کیے گئے
پہلے آتش بازی چھوٹی پھر حضار کو انعامات تقسیم کیے گئے۔ جس کی جو قسمت میں
تھا اُس نے پایا۔ زیسری داس کو جو منتظم تھا ایک ہزار روپیہ غربا و مساکین پر
تقسیم کرنے کے لیے عطا ہوا"

دربار جے پور کا دسہرہ

ذیل کا اقتباس جے پور کے جشن دسہرہ کے متعلق ہے :-

[1] بادشاہ کا خاص محل۔ [2] metcalf [3] مبارک محل کے آثار اب باقی نہیں۔

"خیابان" ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء جلد ۲ نمبر ۱

دسہرہ کے دن داروغہ محلات کو حکم تھا کہ جلوس مرتب کرے
دربار دہلی سے بڑے امرا کو عطا ہوتے تھے آراستہ کیے۔
سنت اور جنت گھوڑوں کا پوجا کرلتے۔ ہر سائیس کو ا
لڈوون کا ایک دونا انعام ملتا، پھر مہاراجہ کی سواری رتہ
تھم نواس" تک جاتی اور اسلحہ کا پوجا ہوتا۔ رزیڈنٹ کو پا...
اور وہ رخصت ہوجاتا۔ مہاراجہ بجے باغ تشریف لاتے میلا...
درخت کی پوجا کے بعد محل واپس ہوجاتے۔

دسہرہ دربار سندھیا میں

دربار سندھیا کی تقریبات دسہرہ... میں پایا جاتا ہے :—

"جب مہاراجہ سندھیا گھوڑوں ہاتھیوں اور اسلحہ کے پوجا سے فارغ ہوجاتا تو
بالا بائی اور راجا صاحب کشتیوں میں شیرنی پیش کرتے۔ مہاراجہ گیارہ اشرفیاں
کشتیوں میں رکھ دیتا اور اُن ملازموں کو جو کشتیاں لاتے رخصت کر دیا جاتا۔
پانچ پارچہ اور کوئی چیز جواہرات کی قسم سے رزیڈنٹ کو بطور تحفہ بھیجی جاتی۔
بھندور راؤ نیز دیگر ارکان حکومت کو خلعت عطا ہوتے۔ شام کے وقت
سواری رام لیلا دیکھنے جاتی۔ بیرام شاہ کے ٹیلے کے قریب سپاہ آراستہ اور
صف بستہ رہتی۔ اور مہراج کی سلامی دیجاتی۔ لیلا کے ملاحظہ کے بعد گنے
تقسیم ہوتے اور مہتمم کو پچاس روپیہ انعام دیا جاتا۔"

دسہرہ دربار رنجیت سنگھ میں

شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں دسہرہ کی تقریبات بڑے تزک و اہتمام سے ہوتے تھے :—

"حسب دستور اسلحہ کی پوجا کے بعد ہی مہاراجہ "کچہری" میں اجلاس کرتا عمال
و وکلا نذریں پیش کرتے۔ اور ہر شخص کو اُسکے رتبہ کے اعتبار سے خلعت عطا

کیا جاتا تھا۔ فرانسیسی افسران کو دو دو ٹوکریاں موسمی پھل اور فی کس دس
دس بوتلیں شراب عطا ہوتیں۔ دوسرے افسران کو صرف ایک ٹوکری اور
ایک بوتل ملتی۔ پچاس بوتلیں اکالیوں میں تقسیم کی جاتیں۔ شام کو مہارانا
کی سواری شاہانہ شان و شوکت خدم و حشم کے ساتھ "تارن تارن" تالاب
آئی اور جب مراجعت ہوتی تو مہاراجہ ہزارہا تماشائیوں پر دونوں ہاتھوں
سے درافشانی کرتا ہوا لوٹتا۔ اسکے بعد بزم رقص و سرود گرم ہوتی اور
ہر رقاصہ کو ایک ایک دوشالہ عطا کیا جاتا"

مرقومہ بالا اقتباسات اس عہد کے صحائف و اخبارات کے "مختصر نوٹ" ہیں۔ لیکن ان
واقعات کو الواح تاریخ میں محفوظ رکھنا چاہیے۔ ہندوستان کے اسٹیج پر اب نہ وہ سین ہیں نہ ایکٹر
زمانہ کروٹیں بدل رہا ہے اور ہر کروٹ میں واقعات نقوش باطل کی طرح صفحہ تاریخ سے محو
ہوتے جاتے ہیں۔

تفسیر حیات

(رشحۂ افکار رابعہ خاتون صاحبہ پنہاںؔ امرت سر)

اے حیات چند روزہ بے بقا و بے ثبات — سحر آرا ہے مگر تیرا طلسم رنگ و بو
کس قدر رنگین ہے حسن چمن زار حیات — ہے نظر افروز کیا دام کیف آرزو

نشۂ صہبائے ہستی کس قدر مسرور کن — ہے مشام آرا عجب بوئے بہار زندگی
شاہد گیتی کا کیف چشم ہے مسحور کن — کر رہا ہے مست انداز نگار زندگی

جلوہ ہائے محفل عشرت ہیں حیرت آفریں — کھینچتے ہیں دلکو یہ نظارہ ہائے جانستاں
جاذب قلب حزیں ہے رنگ دنیائے حسین — روح کو سرمست کر دیتی ہے چشم مے چکاں

چشم انساں ہے اسیر جلوۂ حسن اُمید — قلب و دل ہیں مبتلائے صد فریب آرزو
ناوک حسرت سے ہے اُف سینۂ مضطر شہید — دل کی رگ رگ سے ہے نہاں آرزوئے رنگ و بو

دل کے پردوں میں چھپی ہے حسن دنیا کی کشش — ہے جبیں خم پیش ہر محراب در بہر نیاز
قلب کو کرتی ہے مضطر نوک مژگاں کی خلش — ہے یہ خون جگر حاضر برائے چشم ناز

بے خودانہ مبتلا ہیں جلوۂ محبوب میں — کنہ مخفی کی حقیقت سے بعید و دور تر
محو و بیخود آنکھ ہے نظارۂ مطلوب میں — کیفیات واقعی کی اصلیت سے بے خبر

مدعائے زندگی کا راز کب معلوم ہے — گوش شنوا ہی نہیں پیغام مخفی کے لیے
روح کو پروا نہیں کیا زیست کا مفہوم ہے — زندگی ہے صرف فکر عیش ہستی کے لیے

کیا خبر دیتی ہے تجھ کو گردش ایام سن — او اسیر بند ہستی مست صہبائے حیات
گوش دل سے دور صبح و شام کا پیغام سن — کیا سبق دیتا ہے تجھ کو انقلاب کائنات

مدعائے زیست کے اسرار سے آگاہ ہو — چشم بینا سے رموز مخفی تخلیق دیکھ
جادۂ تفتیش میں آوارہ کر دے روح کو — دیدۂ باطن سے غافل منزل تحقیق دیکھ

عالم اسباب میں پنہاں ہیں انوار ازل — پائے سرگرداں کو کر محو تلاشِ بالعمل

خود نظری

(بقلم علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی حپڑیاکوٹی بی۔ اے۔ لاہور)

نقد و نظر کی جو دُرگت اُردو میں دیکھی جاتی ہے نقد و نظر کی محتاج نہیں۔ یہ عام کیفیت ہے جو صرف معدودے چند مستثنیات کی ہستی تسلیم کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ایک نقاد جب کوئی کتاب یا مضمون سامنے رکھ کر قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو اس نیت کے ساتھ کہ وہ اسمیں سے کون کون سے نقائص اور معایب نکال کر تشہیر کر سکتا ہے۔ یا اس نیت کے ساتھ کہ کہاں تک اس کی مدح سرائی ممکن ہے۔ اس بیسویں صدی عیسوی میں کم تنقیدیں ایسی نکلی ہیں جن سے مصنف مستفید ہو سکے ہوں۔ عام طور پر یہ ہوا ہے کہ اساتذہ سلف کا جہاں تک تعلق ہے۔ ایسی تنقیدوں نے اُردو دنیا کے بڑے طبقے کو دو گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف سے کسی معاملہ میں بھی جو کہا گیا اس کی تردید و تعریض اب فریق ثانی کا فرض مذہبی قرار پا گیا۔ بعضوں نے اپنا اصول بنا لیا ہے ایک خاص شہر یا طبقہ کی جا و بے جا تحقیر و توہین کرنا۔ اسی ضمن میں سرقہ اور اسکے ملحقات کا الزام بھی آجاتا ہے۔ جن کا قلم یہ فرد قرارداد ہمارے بہترین شعرا کے خلاف مرتب کرتا ہے وہ حضرات علم نفسیات اور تاریخ سے بے بہرہ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جب تہذیب اور کلچر ایک ہو۔ شاعری کا میدان اپنی تنگی یا وسعت میں ایک سا ہو۔ جب تحسین کلام کا معیار اور طرز ادا نہ صرف یکساں بلکہ ایک دوسرے سے ماخوذ ہو اور ان مسلمہ عوارض میں شاعری کی بنیاد محض تخیل ہو۔ تو تخیل اور مضامین میں مساوات کا ہونا لابد ہو۔ اب اسے چاہے کوئی سرقہ کہے یا ترجمہ یا تصرف یا توارد۔

اس مقام پر میں ایک خاص نظیر پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ ہے ایک دیوانی کا مقدمہ کاپی رائٹ (حق تصنیف) سے متعلق جو لندن کی پریوی کونسل تک پہونچا۔ مقدمہ کے مفصل کوائف آل انڈیا رپورٹر۔ فروری ۱۹۳۳ء مطبوعہ ناگپور میں ملاحظہ ہوں۔ یہاں صرف اسقدر بتا یا جائے گا کہ مدعی کا دعوے یہ تھا کہ نامور مصنف ایچ۔ جی۔ ولز نے اپنی مشہور عالم کتاب "اوٹ لائنز آف دی

ہسٹری آف دی ورلڈ" میں مدعی کے مسودہ کتاب سے سرقہ بالجبر کیا ہے۔ پریوی کونسل نے دعوے خارج کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ جب دو شخص ایک ہی موضوع پر لکھنے بیٹھیں تو تصنیف و تالیف کا مسالہ۔ سند۔ جستجو یعنے ریسرچ کے ذرایع اور طرز بیان یکساں اور ایک ہی ہونگے۔ اس فیصلہ کا بغور مطالعہ اور اسکے استدلال کا تجزیہ ہمارے بہت سے تنقید کے شیدائیوں کی آنکھیں کھولے گا اور سلف و عہد حاضر کے کئی اچھے شاعروں کے نام پر سے سرقہ کا داغ دھوڈالے گا۔

نقد و نظر کی جب یہ حالت ہو تو نقادوں کی خدمت میں دیر تک حاضر رہنا بے سود ہے اسلیے عزم ہے کہ اس بارے میں کچھ عرض کیا جائے کہ بعض نامی شعرا نے خود اپنے کلام کی نسبت کیا رائے ظاہر کی۔ میں اسے خود نظری کہتا ہوں۔ یہ دیکھنا بھی لطف اور فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ یہ خود نظری آیا بعد کے زمانے نے صحیح تسلیم اور ثابت کی یا نہیں۔ تفصیلات سے کام نہیں لیا جائیگا جیسے کہ یہ امر کہ غالب اور آتش اپنے کس شعر یا اپنی کونسی غزل کو حاصل دیوان یعنے بہترین سمجھتے تھے اور زمانے نے کس کو بہترین تسلیم کیا۔ کیونکہ یہ تنقیح ہم کو ذاتی پسند اور ذوق کے فلسفہ کی بھول بھلیاں میں گرفتار کرے گی۔ جیسے ٹنی سن اپنے جس شعر کو اپنے کلام بھر میں شاہ بیت یعنے بہترین سمجھتا تھا بعد کا زمانہ متفقہ رائے اس کے خلاف رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس مضمون میں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ بعض شعرائے مستند کی اپنے کلام کی نسبت مجموعی رائے کیا تھی اور وہ رائے کہاں تک صحیح نکلی۔ اس سلسلہ میں پہلے مرزا غالب کو لیا جائے گا۔

مرزا کے فارسی دیوان میں یہ غزل نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

تا زدیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن　　این مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است　　شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن
ہم سوادِ صفحہ مشکِ سودہ خواہد بیختن　　ہم دواتم نافِ آہوے ختن خواہد شدن
مطرب از شعرم بہ ہر بزمے کہ خواہد زد نوا　　جا بجا ایثارِ جیبِ پیرہن خواہد شدن
حرف حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت　　دستگاہِ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

ہے چہ می گویم اگر اینست وضعِ روزگار — دفترِ اشعار بابِ سوختن خواہد شدن
آنکہ صورِ نالہ از شورِ نفس موزوں دمید — کاش دیدے کایں نشیدِ شوق فن خواہد شدن
شاہدِ مضموں کہ اینک شہرۂ جان و دل است — روستا آوارۂ کام و دہن خواہد شدن
زاغ راغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں — ہمنوائے پردہ سنجانِ چمن خواہد شدن
دہر بے پروا عیارِ شیوہ ہا خواہد گرفت — داورِ خوں در نہادِ ما و من خواہد شدن

در تہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانۂ
تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

بیچ میں سے کچھ شعر چھوڑ دیے ہیں۔ پوری غزل کلیات میں موجود ہے۔ اس غزل میں مرزا غالب عام مذاقِ سخن اور بالخصوص اپنے کلام کی شہرت کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہیں۔

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

یہاں مطلب اس شعر سے ہے۔ شاید کوئی سرسری میں یہ کہہ نکلے کہ یہ عام کیفیت ذوقِ سخن کی جس کا آیندہ زمانے میں ہونا مرزا کی چشم بینا نے پہلے سے دیکھ لیا محض در صرف فارسی سے تعلق رکھتی ہے اُردو سے اُسکا تعلق نہیں اور نہ مرزا نے غزل کے دوسرے شعر کو اپنے اُردو کلام سے وابستہ کیا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں۔ اس پر استدلال بعد میں ہوگا پہلے میں ایک عام مغالطہ کا دفعیہ کردوں جو اس بارے میں ابھی تک یقین عامہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ مرزا اردو شاعری کو ان کی ہو یا کسی کی ہیچ در پوچ سمجھتے تھے۔ اس مغالطہ کی بنیاد اس شعر پر ہے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من ست

میں نہ اس شعر کا قائل ہوں نہ اُس قطعہ کا جس کا یہ شعر ہے۔ غالبًا یہ قطعہ سہرے کے قضیے کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔ اور صریحًا استاد ذوق کی طرف خطاب ہے۔ اب جو سہرے کا نام آگیا تو فورًا اسکے

مقطع کی طرف ذہن منتقل ہو گیا۔ وہ یہ ہے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

سہرا اردو ہی میں تو مرزا نے کہا تھا۔ اور اسی اپنی اردو گوئی سے متعلق یہ تعلّی فرمائی۔ فارسی قطعہ میں اسی اُردو کو بے رنگ کہکر فارسی کا دعوے دائر کر دیا۔ یہ محض ساعت پرستی یا مصلحت وقت سے اور کچھ نہیں۔ غالب کا اسد شاہی کلام خواہ کیسا ہی ہو غالب جس کلام سے زندہ ہے وہ اسکا اردو کلام اور غالب شاہی کلام ہے۔ ورنہ وہ یہ اشعار ہرگز نہ کہتا:۔

طرز بے دل میں ریختہ کہنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے

غالب اپنا بھی مقولہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے — شاعر تو وہ اچھا ہے یہ بدنام بہت ہے

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب — عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

ان اقتباسات سے دو امر پایۂ ثبوت کو پہونچتے ہیں ایک تو یہ کہ مرزا اردو شاعری کو حقیر نہیں سمجھتے تھے اور یہ کہ وہ اپنے اردو کلام کو بے رنگ اور ہیچ و پوچ نہیں مانتے تھے۔ اسکے علاوہ یہ امر بھی۔ بے دلیل اور حجت کا محتاج نہیں کہ جب انسان کو سخت دلی صدمہ و رالم ہوتا ہے تو وہ جو بین کرتا ہے وہ اپنی خاص زبان میں ہوتا ہے۔ جو اس کی متداول اور عزیز ترین ہو۔ مرزا کے اردو دیوان میں دو نوحے آتے ہیں اور وہ دونوں سوز و گداز سے بھرے ہوئے ہیں خاص کر عارف کی وفات پر جو نوحہ ہے اسکا ایک ایک لفظ سنان اور پیکان ہو کر دل میں اترا جاتا ہے۔ اس شان کا کوئی نوحہ ان کے فارسی کلام میں نہیں۔ جو ترکیب مرزا نے بادشاہ کے فرزند فرخندہ شاہ کی جوان موت پر لکھا وہ صرف نظیری سے مقابلہ کا ہے لیکن نغز گفتاری کا اعلےٰ نمونہ ہے

احساسات قلب کا حال عارف کا نوحہ ہے۔ اس کے علاوہ فارسی میں ایک قطعہ مرزا نے اسی اپنے متبنٰی فرزند عارف کو خطاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

آں پسندیدہ خوے عارف نام   کہ رخش شمع دودمان من ست
اے کہ میراث خوار من باشی   اندر اُردو کہ آں زبان من ست

اب تو اتمام حجت ہو گیا اور ماننا پڑے گا کہ مرزا اُردو کو اپنی زبان تسلیم کرتے تھے اور انھیں اپنی اردو شاعری پر اسقدر فخر تھا کہ اُسے اپنے بیٹے کو میراث میں دے رہے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو فارسی بھی دیدیتے مگر وہ اُنھوں نے نہیں دی۔ حالانکہ عارف مرحوم فارسی میں بھی کہتے تھے[1]۔

مختصر یہ کہ مرزا نے اپنے کلام کی آئندہ شہرت کے بارے میں اپنی خواہد شدن والی غزل میں جو کچھ فرمایا وہ ان کی اردو شاعری پر برابر عائد ہوتا ہی اور جب ہم ان کے اردو کے ایک مقطع پر غور کرتے ہیں تو یہ قیاس یقین کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے وہ مقطع یہ ہے :۔ ؎

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے، کہ مشہور نہیں

اسی مشہور ہونے کی نسبت وہ پیشینگوئی ہی۔ ع قدر شعر من بہ گیتی بعد من خواہد شدن + غالب کی اپنے کلام پر خود نظری ان کی بالغ نظری کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ مضامین غزل ختم ہو چکے تشبیہیں اور استعارے فرسودہ ہو گئے۔ اُردو زبان دفاتر وغیرہ کی زبان ہونے کی وجہ عام ہو گئی۔ اسلیے محض زبان کے شعر بھی اب پروان نہیں چڑھ سکتے۔ انگریزی تعلیم وہ نو بہ نو مناظر حیرت کیطرح آنکھوں کے سامنے پیش کر رہی ہے کہ پرانی دلچسپیاں نظر سے گر جائیں گی۔ اسلئے وہ

---

[1] دہلی میں قاعدہ معلّے سے ایک اخبار نکلا کرتا تھا یہ ہفتہ وار روزنامہ تھا۔ اسکی زبان فارسی تھی۔ خاص بادشاہ کی نگرانی میں نکلتا تھا قلعہ ہی میں مطبع سلطانی میں چھپتا تھا اسکا نام سراج الاخبار تھا۔ اس اخبار کی جلد رابع نمبر ۳۸ مورخہ ۶ مارچ ۱۸۴۴ء میں عارف کی ایک فارسی غزل طبع ہوئی ہے یہ غزل دہلی کے مشاعرے کی طرح میں ہی ایک شعر اسکا یہاں نقل کیا جاتا ہی :۔

نزاکت ہست ترا باعث درستی عہد   وگرنہ شیوۂ خوباں شکست سوگند ست

سمجھتے تھے کہ جس طرح عربی میں متنبی نے کیا ان کی تخئیلی صناعی آئندہ زمانہ کی شاعری کی سرمشق ہوگی یہ امر ثبوت کا محتاج نہیں کہ عہد حاضر میں جتنی تقلید غالب کے طرز کی کی جاتی ہے اور کسی استاد کی نہیں کی جاتی - اور یہ کہ جتنی شہرت غالب کو اس زمانہ میں حاصل ہے اتنی شہرت اور کسی کو نصیب نہیں نہ غالب ہی کو اپنے زمانہ میں نصیب ہوئی - یہ غالب کی خود نظری کا دوسرا ثبوت ہے کہ جس بیدل کو وہ پہلے "عصائے خضر صحرائے سخن" کہا کرتے تھے اس عصا کو آخر کار اپنے ہی ہاتھ سے پھینک دینا پڑا - یہ صلاحیت مذاق خدا کی دین ہے -

اساتذہ نے خود نظری سے کام لے کر اپنے کلام کو بہت ترقی دی - یہی نہیں بلکہ ادب کی اصلاح کی ہے - خواجہ آتش کا شعر ہے سے

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

لیکن کچھ مدت بعد خواجہ کو اس مرصع سازی سے ہاتھ دھونا پڑا اور خود نظری انکے کلام کو سادہ کاری کے معیار پر لے آئی اور اب ان کا مذہب یہ ہو گیا -

ہلادیں دل نہ کیونکر شعر آتش صفا بندش معانی خوبصورت

یہ کیا ہے ؟ محض معضلات اور جمالیات کی جنگ - ذوق سلیم اس سے مستفید ہوتا ہے اور نااہل اپنی بات پر اڑا رہتا ہے -

جزئیات پر نظر ڈالنا اردو میں ناممکن ہے - کیونکہ یہ پتہ چلانا غیر ممکن ہے کہ فلاں غزل یا قصیدے میں شاعر نے خود نظری سے کیا کیا کام لیا ہے اور کہاں کہاں خود اپنی اصلاح کی ہے - اصلاح طرز کی نشان دہی تو ممکن ہے لیکن ہر شعر یا نظم کی اصلاح کا تعین ممکن نہیں - انگریزی میں مشاہیر کے کلام کی یہ کیفیت نہیں - اب چونکہ انگریزی شعرا کا ذکر آگیا بے محل نہ ہوگا اگر یہ بتایا جائے کہ ورڈز ورتھ کی اپنے کلام کے مستقبل کی نسبت کیا رائے تھی - ورڈز ورتھ نے انگریزی شاعری میں وہ کیا جو آزاد نے اردو میں - یعنے نیچرل شاعری کا راستہ نکالا - انگلستان میں اسکی سخت مخالفت ہوئی - اسکی تشریح ذیل کے خط سے ہوگی جو ورڈز ورتھ نے ۲۱ مئی ۱۸۰۷ء کو لیڈی بومنٹ کے نام لکھا :-

"...... میں دیکھتا ہوں کہ آپ کو میری حمایت میں بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں..... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مخالفوں کا یہ جوش و خروش میری نظر سے اوجھل نہیں تھا۔ مجھے صاف نظر آتا تھا کہ میرے دوستوں کو اسکا مقابلہ کرنا پڑیگا۔ ان لوگوں کا یہ طرزِ عمل اصل امر پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتا۔ وہ فیصلہ کرنے کے نا اہل ہیں۔ کولرج کے الفاظ کو آپ نہ بھولیے یعنے ہر بڑے اور جدت پسند شاعر کو چاہیے کہ اپنی عظمت اور جدت کی نسبت سے پبلک میں ایسا مذاق کرے جس سے لوگ اسکے کمال کے معترف ہوں۔ چاہیے کہ وہ اس فن کی تلقین کرے جو اسکے کلام کی خوبیوں کا مظہر بنے یہ بہت کچھ انکے لیے ہے جو اصلاح پسند اور صلح جو طبیعت رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کیلیے جو محض ایک کتاب پر اظہار رائے کیلیے اسکی ورق گردانی کرتے ہیں ان گمراہ کرنے والوں اور گمراہ چلنے والوں کیلیے بالکل خالی الذہن اور تجدیدِ حیات کا ہونا لازمی ہے۔ اور یہ کام ہے وقت کا۔ یعنی اسے مدت چاہیے"

چنانچہ ایک مدت گذرنے کے بعد ورڈزورتھ نے اپنے مخالفوں سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ اور آج انگریزی شاعری میں تجدیدِ عمل کا سہرا اسی کے سر ہے۔

اب عام اردو شاعری اور ادب کی نسبت ایک مصلح کی خود نظری یا پیش گوئی کے ساتھ اس تحریر کو ختم کیا جاتا ہے۔ اسے خواہ آزاد مرحوم کی اپیل کا نتیجہ کہیے یا پیش گوئی۔ بات ایک ہی ہے نئی شاعری کی داغ بیل ڈالتے ہوے آزاد نے کہا تھا: "نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں... ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہموطن انگریزی دانوں کے پاس ہے....." اس کنجی نے ان صندوقوں کے قفل کھولے اور وہ خلعت و زیور اردو شاعری کو پہنائے گئے۔ ان کی بدولت اُردو نئی نویلی دلھن بن گئی۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آج اُردو نظم اور نثر لکھنے والوں اور اچھا کہنے والوں میں بڑی اکثریت آزاد کے انگریزی دانوں کی ہے۔

تبرکات شاد

(خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی مغفور کا غیر مطبوعہ کلام)

ہم سے نہ حق ادا ہوا عشق کرشمہ ساز کا — شکوہ کریں تو کیا کریں جان بہانہ باز کا

اے دل مضطرب ٹھہر وقت سوال بھی تو ہو — ہمکو بھی نام یاد ہے اپنے گدا نواز کا

ہو گی جب اپنی آنکھ بند آئیگا وہ بھلی کبھی — دیکھ سکا نہ جو سماں دیدۂ نیم باز کا

بار سبو وہی اُٹھائے جس پہ ہو فضل مے فروش — زاہد خشک یہ بھی کیا بوجھ ہے جانماز کا

پیر مغاں کے معجزے دیکھ چکے ہو واعظو — تم نہ پیو جو مے تو خیر حکم تو دو جواز کا

خوش تو ہیں یاد حشر سے منتظران سادہ لوح — ہو نہ کرشمہ یہ کسی دلبر حیلہ ساز کا

قصہ ہجر تا کجا تھک بھی چکے مری زباں — ہو بھی تو خاتمہ کہیں اس گلۂ دراز کا

دیر سے منتظر ہیں وہ عذر نہ کر خدا کو مان — جان بلب رسیدہ آہ کون محل ہے ناز کا

جلوۂ حسن کیطرف دیکھ تو کچھ پتہ ملے — جانے دے ولولہ نہ پوچھ عاشق پاکباز کا

خاک بہت سی چھان کر دشت و جبل سے ہم پھر آئے

تو بھی پتا ملا نہ شاد قافلۂ مجاز کا

ظرافت کا ماحول

(مولینا سید محمد حسین صاحب ایم اے ایل ایل بی، منشی فاضل، مولوی فاضل، ملا فاضل لکچرار اردو لکھنؤ یونیورسٹی)

ظرافت کی بہت سی تعریفیں کی جاتی ہیں، کوئی کہتا ہے خوش کلامی کا نام ظرافت ہے، کسی کا قول ہے کہ "ظرافت" سنجیدہ ہرزہ گوئی کو کہتے ہیں، کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ مسخراپن ظرافت کے مترادف ہے۔ انگلستان کا روزنامہ مارننگ پوسٹ Morning Post ظرافت کو ابلہ فریبی سے تعبیر کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر کس بخیال خویش خبطے دارد ہم سے اگر کوئی پوچھے تو ہم کہیں گے کہ جس سے دل خوش ہو وہ ظرافت ہے۔ ایک انگریز مدبر نے ظرافت کی تعریف اپنے سیاسی نقطۂ نظر سے کیا خوب کی ہے؟ وہ کہتا ہے کہ "انگلستان جب ہنسے تو ظرافت ہے"۔

ظرافت میں ہر قوم کا تھوڑا بہت حصہ ہے امریکہ نے مارک ٹوین (Mark Twain) اسٹیفن لیکاک (Stephen Leacock) ہرالڈ لائڈ (Harold Lloyd) جیسے ظریف پیدا کیے ہیں۔ لیکن انگریز یہی خیال کرتے ہیں کہ امریکہ نے جو نمایاں حصہ دنیا کی ظرافت میں لیا ہے "وہ چھوٹی سستی کار" ایجاد کرکے ہے۔ جہاں تک ظرافت کا تعلق ہے امریکہ کو انگلستان سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ انگلستان کی آب و ہوا۔ فضا ماحول۔ معاشرت و تمدن بلکہ وہ غذا جو اہل انگلستان کھاتے ہیں ظرافت پیدا کرتی ہے۔ اسکاٹ لینڈ انگلستان سے چند قدم آگے ہے۔ وہاں کے باشندے فطرتاً ظریف واقع ہوے ہیں۔ اور ایسے ظریف گویا ظرافت ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ ایک اسکاچ (باشندۂ اسکاٹ لینڈ) کی طرف دیکھو اسکے چہرہ سے کیسی ظرافت ٹپک رہی ہے۔

انگریز ظرافت کے تین اقسام بتلاتے ہیں (۱) ایک وہ چھپتی ہوئی ظرافت ہے، جو مشہور صحیفہ پنچ (Punch) میں ہوتی ہے۔ اسکا مفہوم صرف اتنا ہے ع خوش باش دمے کہ زندگانی اپنی ست ہے یہ ذہنیت اور رسا دماغوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ غالب ایسا ہی ایک ظریف تھا۔

یہ درد کا پہلو لیے ہوتی ہے یعنے ایسے قہقہے جن کے عناصر میں نالہائے نیم شبی شامل ہیں۔ دوسری قسم ظرافت اس سے اکثر وسیع دائرہ رکھتی ہے وہ جدیدہ ہیومرسٹ (Humourist) کی ظرافت ہے۔ اسمیں طنز کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ یہ سودا کی ظرافت ہے اس کے قہقہے خندہا ئے بے جا نہیں بلکہ تازیانہائے عبرت ہیں جو ملک و قوم کی ابتری پر بے اختیار وارد ہوتے ہیں۔ تیسری قسم ظرافت کی عام اور سوقیانہ ہے وہ پاسنگ شو (Passing Show) ٹٹ بٹس (Titbits) اور لندن اوپنین (London Opinion) جیسے ظریفانہ رسائل میں پائی جاتی ہے۔ یہ مسخرے پن کے علاوہ کچھ نہیں۔ سب کو پسند آتی ہے اور کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ بلکہ شاید صحت و تندرستی پر دال ہے۔ جب معدہ کا فعل درست ہوگا۔ انسان صحیح و توانا ہوگا خواہ مخواہ ہنسے گا۔ جرمنی کا مشہور فلسفی پریشان قہقہوں کو سمندر کے جھین سے تشبیہ دیتا ہے کہ دیکھنے میں بچوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے لیکن جب وہ دوڑکر اسکو ہاتھ میں لے لیتا ہے تو معدوم ہوجاتا ہے یعنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ "ہیومر" (Humour) اس قسم کی ہنسی کو نہیں کہتے۔ ہیومر میں وہ ہنسی ہوتی ہے جو رونے سے بہت قریب ہے۔ اکثر انسان پر جب بہت تکلیف گذرتی ہے تو وہ رونے کے بجائے بے اختیار ہنس دیتا ہے میر و سودا اپنے زمانہ کی حالت سے یکساں متاثر ہوے۔ ایک رویا ایک ہنس پڑا۔ ایک کا کلام آہ ہے ایک کا "واہ" لیکن دونوں کی تہ میں ایک ہی درد پوشیدہ ہے جس نے دونوں کو دو مختلف طریقوں سے ابھارا۔

ہندوستان ظرافت سے ناآشنا تو نہیں لیکن اسکی آب و ہوا ظرافت کے مزاج کے موافق نہیں۔ ہندوستان کی جغرافیائی حالت، اسکا ماحول اسکو ظرافت سے بیگانہ کیے ہوئے ہے، ہم میں اگر ظرافت و سنجیدگی کا توازن کیا جائے تو سنجیدگی کا پلہ بھاری نکلے گا۔ جہاں تک ظرافت کا تعلق ہے ہندوستان کیلیے باعتبار سنجیدگی ہزاروں فلسفی پیدا کرنا آسان ہے۔ لیکن ایک چارلس ڈکنس (Charles Dickens) پیدا کرنا بہت مشکل۔ ایک مبصر کے خیال کے مطابق غذا میں ترکاریاں واناج کا زیادہ استعمال ظرافت کے مادہ کو فنا کر دیتا ہے۔ تیز محرک

اشیا ظرافت پیدا کرتی ہیں۔ گوشت اور شراب ظرافت پیدا کرنے میں معین ہوتے ہیں۔ سنجیدگی ایک مطمئن پُرسکون دماغ چاہتی ہے لیکن شوخی۔ ذکاوت اور تخیل کی بلند پروازی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہندوستانی غذا جسم میں اُن اخلاط کو پیدا نہیں ہونے دیتی جو تحریکات کا باعث ہوتے ہیں وہ ہمارے دماغ کو ایک سلجھا ہوا اور ایک ٹھہرے ہوئے دریا کی طرح پرسکون رکھتی ہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ قدیم ہندوستان کو فلسفہ میں یدطولی حاصل ہو گیا۔ اور ہندوستان کے فلسفہ کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔

مردوں اور عورتوں کی ظرافت میں بھی نمایاں امتیاز ہے۔ عورتوں کا معیار ظرافت بلند ہے۔ ایک وہ چیز جو ہر مرد کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل ڈال دے ضروری نہیں کہ عورت کے اوپر بھی اتنا ہی اثر کرے۔ ایک شخص جو قدرتاً معذور ہے اور زمین پر اُٹو کرتا ہوا چلتا ہے مردوں کی تفریح طبع کا اچھا خاصہ آلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن کیسی ہی عورت ہو اُسکا دل اسکی ناچاری پر اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور وہ اس کو دیکھ کر اپنے دل میں کڑھ جانے لگی۔ باتوں میں دل آزاری کا پہلو عورتوں کے لیے مطلق ظرافت نہیں رکھتا اور نہ ان کو ایسی ظرافت سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ صاف سُتھری اور بے غرض ظرافت کی چاشنی چکھنا چاہتی ہیں۔

بچوں میں بہ نسبت ہمارے زیادہ ظرافت ہوتی ہے۔ یہ وہ ظرافت ہے جو قدرت نے انکو ودیعت کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کی فطرت میں کم و بیش ظرافت موجود ہے یہ اسکی پوشیدہ قوت ہے جس کو اگر وہ استعمال میں لاتا ہے تو وہ اسکے سن کے ساتھ ترقی کرتی رہے گی اور مرتے دم تک اُسکا ساتھ نہ چھوڑے گی۔ یہ غلط ہے کہ بڑھاپا ہم سے ظرافت کو چھین لیتا ہے۔ جوانی ہو یا بڑھاپا ظرافت ہر عمر میں ہم میں موجود رہتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بڑھاپے میں ظرافت پر ادر جلا ہو جاتی ہے اور اسمیں سنجیدگی جھلکنے لگتی ہے جس سے اسکا معیار مرتفع ہو جاتا ہے۔

بچہ کا کوئی فعل ظرافت سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کو اسمیں ظرافت نہ دکھلائی دے چونکہ بچہ کی رگ رگ میں ظرافت لہریں مارتی ہے اس وجہ سے وہ اپنے سنجیدہ سے سنجیدہ فعل میں ظرافت محسوس کر لیتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے "بچہ کی روح ظرافت ہے"۔ اسکے یہ معنے ہیں کہ جب

ظرافت کا یہ مدعا ہے کہ کوئی چیز جو ہمکو خوش کرے اور مسکرا دے ظرافت ہے تو یقیناً بچہ جو کچھ بھی اپنی خوشی سے کرتا ہو وہ ظرافت ہے۔ اگر وہ کسی فعل کو جبراً و قہراً کرتا ہے تو اسکی وجہ یہ ہو کہ وہ اسمیں ظرافت کی روح نہیں پاتا۔ ایک بات جو ہمارے لیے سنجیدہ ترین ہے بچہ کے لیے دقیق اور ناقابل عمل ہونے کے سبب سے ظرافت خیز ہو جاتی ہے اور جب ہم اسکی سنجیدگی پر ناک بھوں چڑھاتے اور منھ بناتے ہیں تو بچہ اپنے خیال کے مطابق ہماری ان حرکتوں کی مہملیت پر خوب لطف اندوز ہوتا ہو اور بعض اوقات تو ایسا آپ سے باہر ہو جاتا ہے کہ ہنسی کے مارے لوٹا لوٹا پھرتا ہے۔

ظرافت حیات انسانی کا ایک ضروری عنصر ہے اور ظرفا انسان کے محسن ہیں۔ ظرافت انسان کی روح کو پژمردگی سے محفوظ رکھتی ہے اور وہ انسان کے دل کو کنول کے پھول کی طرح ہمیشہ تازہ رکھتی ہو ظرافت فکروں کو جو انسانی زندگی میں گھن لگا دیتی ہیں دور کرتی ہے۔ ظرافت انسان میں سنجیدگی و استقلال پیدا کرتی ہے۔ ظرافت شرار و برق کی طرح اپنا کام کرتی ہے اور آناً فاناً میں ہمکو اپنا معمول کر لیتی ہے۔ وہ ایک ایسا سحر ہے جس سے انسان کبھی بیش نہیں پا سکتا۔ وہ انسان پر اس عزت کے ساتھ اپنا اثر کرتی ہے کہ وہ آپ سے باہر ہو جاتا ہے اور فرط انبساط میں بیساختہ ہنسنے لگتا ہے۔ دنیا کے پند و نصائح اپنے سنجیدہ لباس میں ہیبتناک ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ظرافت کے جامہ میں پیش کیے جاویں تو دل ہی میں اُتر کر رہینگے۔ انگلستان کی تاریخ میں کسی شخص کا نام نہیں لیا جا سکتا جس نے نسل انسانی کے لیے چارلس ڈکنس (Charles Dickens) سے زیادہ کیا ہو۔ ڈکنس کے (Dickens) پکوک پیپرس نے ظرافت کے دریا بہا کر انگریزوں کی زندگی کے دستور العمل کو ایسا مستحکم بنا دیا اور ایسی تنظیم پیدا کر دی جس سے انگلستان کے قوانین کا ایک مکمل دفتر قاصر رہا۔

ظرافت بڈھے کو جوان بنا دیتی ہے اور اسمیں وہ روح پیدا کر دیتی ہے جو سن و سال کے اضمحلال و انحطاط کو اس سے ہمکنار ہونے نہیں دیتی۔

اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ ظرافت انسانی زندگی کی بقا کا ایک آلہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

غزل

(نتائج تازہ لسان القوم حضرت مولانا صفیؔ لکھنوی)

قبر کی ظلمت شبِ فرقت کدھر چھائی نہیں — لاکھ چاہا موت آجائے مگر آئی نہیں

آسرا اک شمع کا تھا وہ بھی آخر جل بجھی — اب تو کوئی بھی انیسِ شامِ تنہائی نہیں

کہہ رہی ہے نزع کی الجھن تنِ رنجور سے — ہے یہ تمہیدِ وداعِ ہوش انگڑائی نہیں

آشنا تھے جسقدر سب ہو گئے ناآشنا — اس طرح جیسے کسی سے بھی شناسائی نہیں

رحم کر اے چارہ سازِ خستہ حالاں رحم کر — اب دلِ بیتاب کو تابِ شکیبائی نہیں

بسترِ غم پر مریضِ عشق کروٹ لے سکے — جسمِ ناطاقت میں اتنی بھی توانائی نہیں

کیا وہ جسمِ زار جو مجموعۂ آزار ہو — ضعفِ دل ضعفِ جگر یا ضعفِ بینائی نہیں

سخت جانی ان مصائب کا تحمل تا بکے — دوسری اب آ رہی ہے اک بلا آئی نہیں

وادیِ غربت سے تا سرحدِ صحرائے عدم — عشق تو نے کس سے کس سے خاک چھنوائی نہیں

ڈرتے ہیں بدنامیوں سے عاشقانِ خام کار — پختہ مغزانِ جنوں کو خوفِ رسوائی نہیں

اس خراباتِ جہاں میں رہ کے آخر کیا کریں — جب موافق اپنے دورِ چرخِ مینائی نہیں

تم سمجھتے ہو کہ دنیا ایک اچھی چیز ہے — میں سمجھتا ہوں کہ اسمیں کوئی اچھائی نہیں

زندگی کا ماحصل کیا ہے بتا دوں میں صفیؔ
انتظار اسکا ابھی تک جو بلا آئی نہیں

نظر جوہر شناس

لامیہ سودا مع شرح مختصر

از سید محمد حسین صاحب ایم اے، ایل ایل بی، مولوی فاضل، منشی فاضل، ملا فاضل، لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی۔ سائز [illegible] بر چار جزو سفید کاغذ مطبوعہ دین محمدی پریس لکھنؤ۔ ۱۹۳۰ء۔ کتاب شارح سے مل سکتی ہے۔

اساتذہ اردو میں اسوقت تک صرف مرزا غالب کے کلام پر توجہ کی گئی اور متعدد شرحیں لکھی گئیں مگر تعلیمی ضرورتوں نے محسوس کرا دیا کہ ہنوز اور شعرا کا کلام بھی محتاج شرح ہے۔ کتاب زیر نظر مرزا محمد رفیع سودا کے صرف ایک قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے :-

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

کی شرح ہے شارح نے اپنی تمہید مختصر میں سودا کے خصوصیات کلام پر بھی بحث کی ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ سودا نے اپنے حسب عادت یہ قصیدہ عرفی کے مشہور لامیہ

چہرہ پرداز جہاں رخت کشد چوں بہ حمل
شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

کی تقلید میں کہا ہے۔ عرفی کے قصیدہ کی ابتدا بہار سے ہی لہذا سودا نے بھی ذکر باغ و بہار سے آغاز کیا ہے۔ عرفی نے گھوڑے کی تعریف کی ہے تو سودا نے بھی اشہب قلم کو میدان قرطاس پر گھوڑے کی تعریف میں دوڑایا ہے۔ اسی طرح عرفی کا قصیدہ دعا پر ختم ہوتا ہے تو سودا نے بھی آخر میں دعائیہ اشعار کہے ہیں۔ سودا نے ایک مصرع کی تضمین کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قصیدہ کے کہتے وقت عرفی کا مشہور لامیہ سودا کے پیش نظر تھا۔ دونوں قصیدوں کی بحر ایک قوافی ایک اور ساخت بھی ایک ہے۔ عرفی کا قصیدہ نقش اول ہے اور فارسی میں ہے اور سودا کا قصیدہ اردو میں ہے اور عرفی کی تقلید میں ہے۔ تاہم اگر دونوں قصائد کا توازن کیا جائے تو ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا آسان نہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ سودا کی زبان عرفی کی زبان کی حلاوت کے سامنے پیش نہیں پا سکتی۔ عرفی بلاغت و فصاحت دونوں اقالیم پر کامرانی کرتا ہے لیکن سودا تخیلات میں خواہ کتنی ہی بلند پروازیاں دکھلائے زبان کی لطافت و سلاست کا

مدعی نہیں ہو سکتا۔ سودا نے اس قصیدہ میں ایک دوراندیشی اور کی ہے اور وہ یہ ہے کہ عرفی کا ممدوح میر ابوالفتح ہے اور اسکا ممدوح حضرت علی۔ لہذا ظاہر ہے سودا کی مدح کا میدان عرفی سے زیادہ وسیع ہے اس اعتبار سے سودا کا قصیدہ بھاری بھرکم ہو جاتا ہے۔ عرفی کے بعد اس زمین میں قصیدہ کہنا آسان نہ تھا لیکن یہ سودا ہی کا کام تھا کہ اس نے قصیدہ کہا اور وہ جدت طرازیاں کیں کہ تتبع کے بدنما دھبہ کو اپنے دامن سے مٹا دیا۔

شارح نے شرح میں بہت صاف اور سلیس زبان استعمال کی ہے اور مطالب اشعار کو خوش اسلوبی سے حل کیا ہے جا بجا فارسی اور عربی کے ہم مضمون ابیات بھی لکھے ہیں اور ہر ممکن طریقہ سے مطلب ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے صرف ایک قصیدہ کی شرح شایع کرنا بادی النظر میں مضحکہ خیز معلوم ہوگا مگر کتاب زیر نظر ایک آزمایش ہے جس کے کامیاب اور مقبول ہونے پر شارح کا ارادہ انتخاب قصائد سودا کی مکمل شرح شایع کرنا ہے۔

کتاب پر حضرت عزیز لکھنوی نے مختصر تقریظ کی ہے شارح نے اپنے جذبہ عقیدت میں اردو کے سچے ہمدرد و سرپرست پنڈت منوہر لال زتشی ایم اے آئی ای ایس سابق پرنسپل ٹریننگ کالج لکھنو کے نام نامی سے کتاب کو معنون کیا ہے۔ کتابت و طباعت بری نہیں۔

تاریخ اسلام

پانچ جلد مولفہ حضرت شوق امرتسری مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور۔ ناشر ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب کشمیری بازار لاہور۔ قیمت ؏ ر

ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز لاہور اس مفید و پر معلومات تصنیف کے شایع کرنے پر قابل مبارکباد ہیں۔ تاریخ اسلام پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد سنہ ہجری سے ایک صدی قبل تا ۱۱ھ مطابق ۵۶۹ء سے ۶۳۲ء تک کے واقعات کی حامل ہے اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کی سوانح حیات کو لپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے یہ ایک اچھی خاصی ۸۰۰ صفحات کی ضخیم کتاب ہے۔ دوسری جلد جس کا حقیقی نام تاریخ خلفائے راشدین ہے از ۱۱ھ تا ۴۰ھ مطابق ۶۳۲ء تا ۶۶۱ء کے واقعات سے بحث کرتی ہے۔ یہ ۴۸۰ صفحہ کی کتاب ہے۔ خلافت عظمیٰ کی تاریخ کے علاوہ ترقی اسلام و

فتوحات کا بھی مشرح تذکرہ ہے۔ تیسری جلد ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ مطابق ۶۶۲ء تا ۷۵۰ء کے واقعات کا آئینہ ہے۔ اسکا دوسرا نام تاریخ خلفائے بنی امیہ ہے۔ اسمیں بھی جلد سابق کی طرح ملکی فتوحات کا ذکر ہے جلد ہذا ۹ جزو پر مشتمل ہے۔ جلد چہارم تاریخ خلفائے بنی عباسیہ ہے اور ۱۳۲ھ سے ۹۲۳ھ مطابق ۷۵۰ء تا ۱۵۱۷ء کے واقعات کی مشرح ہے۔ اسلامی فتوحات پر اسمیں بھی مفصل بحث ہے۔ جلد ہذا ۱۰ جزو کی ضخامت رکھتی ہے۔ جلد پنجم ۹ جزو پر مشتمل ہے اس کا حقیقی نام تاریخ سلاطین عثمانیہ و ترکان احرار ہے اور ۱۵۱۷ء مطابق ۹۲۳ھ سے تا ایندم کے واقعات کا تبصرہ ہے۔ اسلام کی تاریخ پانچ ازمنہ میں تقسیم کرنا قابل ستایش ہے یہ ایک اسلامی انسائیکلوپیڈیا کا کام کرتی ہے۔ اور واقعات نگاری کے اعتبار سے یقیناً قابل قدر ہے۔ سب سے زیادہ مستحسن امر یہ ہے کہ متنازعہ فیہ واقعات سے اجتناب کر کے محقق حالات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ پانچوں جلدیں چھپی بھی خوب ہیں۔ تعجب ہے کہ اتنی ضخیم کتاب کی مجموعی قیمت صرف ۔ے رکھی گئی ہے جو اس کے فوائد کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی یونین جرنل کا سالنامہ ۱۹۳۳ء بغرض ریویو موصول ہوا ہے۔ اسکے تین حصے ہیں انگریزی ہندی اور اردو۔ تعجب ہے کہ انگریزی حصہ میں کسی پروفیسر کا کوئی مضمون نہیں، طلبا کے مضامین دلچسپ ہیں۔ ہندی حصہ بھی خوب ہے۔ اردو حصہ میں سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کا "شہر پر آشوب" پر اور شیخ مشیر حسین قدوائی ممبر کونسل آف اسٹیٹ کا مضمون "گول میز کانفرنسوں کا چکر" پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مدیران کو ترتیب میں خاص سلیقہ ہے، طباعت دیدہ زیب ہے۔ یونین اپنی اس علمی و ادبی پیداوار پر ضرور قابل مبارکباد ہے۔ مصورہ کی تصویر نظر کش ہے کیا کہنا؟

رسید کتب

طلسم زندگی مصنفہ بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا لاہور۔ مختصر مضامین کا ایک مصور مجموعہ۔

مغل[2] اور اردو ۔ مصنفہ ادیب الملک نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال۔

جدید[3] اردو شاعری ۔ مصنفہ پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے، ایل ایل بی ۔ شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن)

دوشیزہ[4] ۔ سلسلہ تربیت الانسان ۔ دوسرا ایڈیشن مصنفہ حکیم محمد یوسف حسن اڈیٹر نیرنگ خیال لاہور

گلنینگس[5] Gleanings انگریزی زبان میں پنڈت منوہر لال صاحب زتشی ایم اے آئی ای ایس کے انگریزی مضامین کا مجموعہ مقدمہ مسٹر سی وائی چنتامنی نے تحریر کیا ہے

ہندو[6] تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافیائی کیفیت ہندی اور اردو ایڈیشن مصنفہ بابو رام پرشاد بی اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بستی (یو۔ پی)

محشرستان[7] ۔ حضرت محشر عابدی بی اے کے مختصر افسانوں کا مجموعہ۔

صدسالے[8] ماہر ۔ مصنفہ حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر دہلوی۔

سلیقہ[9] بیگم ۔ ایک مختصر اصلاحی افسانہ نوشتہ حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی ثم دہلوی۔

حقوق[10] نسواں اور اسلام ۔ مصنفہ مولوی سید محمد رضی صاحب لکھنوی۔

من[11] کی بانسری ۔ امیر احمد صاحب بی اے ۔ بی ٹی اورنگ آبادی۔

منکران[12] خدا سے خطاب ۔ مولوی سید علی اختر صاحب اختر۔

تجدید[13] عمل حصہ اول و[14] دوم ۔ مصنفہ مرزا عسکری علی خاں مجازی۔

فلسفہ[15] قرآن و اہلبیت ۔ شان[16] صبر، کشف[17] حقیقت یا راز قدرت و ارواح[18] تصوف میں اہل چل تصانیف مولوی سید زوار حسین مدرس فارسی گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج اٹاوہ۔

تحریر[19] النساء موہنی ۔ ایک اخلاقی ناول تصانیف صغریٰ ہمایوں مرزا صاحبہ۔

کرشمہ[20] تقدیر و اسوۂ حسینی ۔ مصنفہ ہمایوں مرزا بیرسٹر حیدرآباد (دکن)

رپورٹ[21] ۔ نظم و نسق انجمن خواتین (دکن) مرتبہ محمدی بیگم صاحبہ بی اے، حیدرآباد (دکن)

مؤلف و مترجم

"شہنشاہ حسین رضوی"

(ایم، اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)

(ایم۔ آر۔ اے ایس (لندن)

مطبوعہ نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

خیابان
مرتبہ
شہنشاہ حسین، رضوی
ایم، اے۔ ایل، ایل، بی۔ (علیگ)
ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن)
نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں طبع ہوا

خیابان کے اغراض اشاعت

۱۔ اُردو زبان و ادب کی تحقیق و تدقیق (ریسرچ) اور اصلاح۔

۲۔ اردو میں علوم مغربیہ و مشرقیہ کی ترویج

۳۔ سلف صالحین کے علمی کارناموں کا احیاء

۴۔ باقیات الصالحات کے علمی تحقیقات کی اشاعت

۵۔ دوسری زبانوں کے علمی تراجم، اقتباسات

۶۔ مطبوعات جدیدہ پر تنقید و تبصرہ

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر شمسی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوگا۔

(۲) پندرہ تاریخ تک اگر رسالہ نہ پہونچے تو دوبارہ طلب فرمائیے۔

(۳) قیمت سالانہ صہ ششماہی سے ر ششماہی سے کم رسالہ کا اجرا نہو سکیگا۔

(۴) نمونہ کا پرچہ ۸ر کے ٹکٹ بھیجکر منگوایا جاسکے گا۔

(۵) تمام مراسلت متعلق ترسیل زر، اجرت اشتہارات و ایجنسی وغیرہ بنام منیجر خیابان ہونا چاہیے

(۶) تمام مراسلت متعلق ادارت و ترتیب بنام مدیر مرتب (اڈیٹر خیابان) ہونا چاہیے

(۷) صرف محققانہ مضامین خیابان میں جگہ پاسکیں گے، غیر مستند شعرا کا کلام خیابان میں شایع نہو سکیگا۔

دارالاشاعت، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ،

تمثال مؤلف بزم ایران آقای حاجی سیّد محمد رضا طباطبائے الیزدی

خیابان کی بزم تحقیق

ہمارے معاونین قلمی

مبصر مصورات خان بہادر نواب سید مظفر علی خاں صاحب زین اعظم جانشٹھ

ادبیات:- سر ڈاکٹر محمد اقبال - نواب حیدر یار جنگ بہادر سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی۔
لسان القوم مولانا سید علی نقی صاحب صفی نواب نصیر حسین خیال پنڈت منوہر لال زتشی
مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے۔ مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز مرزا کاظم حسین صاحب محشر
نواب جعفر علی خاں صاحب اثر سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے، سید محمد حفیظ صاحب بی اے
پروفیسر مہدی حسین صاحب ناصری ایم اے۔ آغا شاعر صاحب لکھنوی عبد المجید صاحب سالک لاہور

سیاسیات سر ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، سید جالب صاحب دہلوی پنڈت کشن پرشاد کول - مسٹر
امیر احمد عباسی، بی۔اے

تعلیمات خواجہ غلام السیدین۔بی۔اے - ایم۔ای۔ڈی (لیڈز) سجاد مرزا صاحب ایم اے آکسن

تاریخ و جغرافیہ علامہ عبد اللہ یوسف علی، پروفیسر محمد حبیب بی اے (آکسن) ایم آر۔اے ایس بیرسٹر ایٹ لا۔
مولانا عبد الحلیم صاحب شرر۔ امیر احمد صاحب علوی، بی۔اے۔ قاضی جلال الدین ایف آر جی ایس

فلسفہ مسٹر عبد اللہ یوسف علی ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا، مولانا عبد الحسین صاحب پروفیسر
معقولات جامعہ سلطانیہ مولوی محمد عبد البقا۔بی۔اے (علیگ)

اقتصادیات علامہ عبد اللہ یوسف علی، پروفیسر اقبال بہادر سکینہ، ایم۔اے

سائنس مسٹر فیروز الدین مراد۔بی۔اے، ایم ایس سی ایف آر ایس اے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
مسٹر شرف حسین رضوی۔بی۔ایس۔سی۔ایل۔ایل بی مسٹر حضور الحسن بی، ایس سی لکچرار

تنقید و تبصرہ - مسٹر مسعود حسن رضوی، ایم اے، ابو البراعۃ مولانا سید ظفر مہدی جائسی

مدیر مرتب:-

تنقیح ۱۹۲۵ خیر

بنام جہاندار جان آفرین

عالم ہمہ افسانۂ ماست

خیر مقدم

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو "الہ آباد"۔

"میں امید کرتا ہوں کہ آپکا رسالہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا"

علامہ عبداللہ یوسف علی ایم۔ اے (آکسن) ایل۔ ایل ایم آئی سی ایس۔ سی۔ بی ای۔ بیرسٹرایٹ لا وپرنسپل اسلامیہ کالج لاہور:۔

"مجھے امید ہے کہ آپکی یہ ادبی کوشش یعنی "خیابان" آپ کے نکتہ نظر سے نہ صرف کامیاب ہی ہوگی بلکہ ادب اردو کیلئے ایک جدید خیابان کا اضافہ کرسکے گی۔"

نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ علی حیدر صاحب نظم طباطبائی حیدرآباد (دکن)

"خدا خیابان کو حسن قبول عنایت کرے۔"

نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال کلکتہ

"لکھنؤ کو زبان پر حق شفع حاصل ہے اس لحاظ سے چاہتا ہوں کہ وہاں کی قدیم وجدید زبان وشاعری پر اپنے خیالات قلمبند کروں اور اس کی اشاعت کے لئے "خیابان" سے بہتر رسالہ نہیں"

پروفیسر ناصری ایم۔ اے۔ مہدی حسین صاحب، بارہ بنکی۔

"خیابان" کا جاری ہونا آپ کی ادارت میں انشاء اللہ مفید ہے اور اردو لٹریچر میں گراں بہا اضافہ"

مسٹر بادمرزا، ایم۔ اے۔ آکسن، صدر مہتمم تعلیمات صوبہ گلبرگہ (دکن):۔

"خیابان" ظاہری اور باطنی حیثیت سے یورپ کے رسالوں سے ہمسری کرے گا۔ آپ کا یہ منصوبہ قابلِ تعریف ہے مجھے امید ہے کہ خیابان آپ کی ادارت میں بہت جلد ایک ممتاز حیثیت حاصل کریگا اور ہندوستان کے تعلیمی طبقہ کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کرکے چھوڑے گا۔

آغا اشہر صاحب لکھنوی مولفؒ حضرت رشید" سیتا پور:۔

"میں دنیائے ادب کیلئے آپ کی سعی کو ایک نویدِ روح افزا سمجھتا ہوں' خیابان کی جدید نوعیت اور مغربیت نگاہوں کو خود اپنی طرف کھینچ لے گی۔

مولانا طفیل احمد (علیگ) جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ:۔

"دل سے دعا ہے کہ خدا خیابان کو کامیاب کرے"

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی ڈپٹی کلکٹر اناؤ:۔

"خیابان کا بیتابی کے ساتھ انتظار ہے"

خواجہ اسد اللہ صاحب اسد سب اڈیٹر روزنامہ ہمدم لکھنؤ:۔

"دنیائے ادب کے لئے خیابان کا اجرا، ایک نویدِ مسرت افزا ہے"

حضرت محشر:۔ مرزا کاظم حسین صاحب لکھنوی:۔

چھپائے ہے گلِ معنی رنگا رنگ داماں میں
گلستانِ سخن کی سو بہاریں ہیں خیاباں میں

خیاباں ہے کہ اربابِ نظر کا آئنہ کہیے
کھنچی جاتی ہے جسکے حسن کی تصویر چشمِ انساں میں

خیاباں ہے کہ نظم و نثر کا مجموعۂ رنگیں
جو ہے اک دفترِ علم و عمل بزمِ سخنداں میں

خیاباں خلوتِ محبوب میں ہے مثلِ آئینہ
خیاباں ہے دلِ عاشق کی صورت بزمِ جاناں میں

خیاباں درحقیقت یوسفِ مصرِ ادب نکلا
کہ جسپر ٹوٹتے ہیں مشتری بازارِ کنعاں میں

خیاباں کیا ہے اک آبادِ محفل اہلِ معنیٰ کی
کہ جنکو چور دیکھا نشۂ صہبائے عرفاں میں

خیاباں ایک سیدھا راستہ ہے باغِ اردو کا
زباں داں ہو گیا جو کوئی آیا اس گلستاں میں

معانی و بیاں ہو یا فصاحت یا بلاغت ہو
غرض یہ ہے کہ اے محشر سبھی کچھ ہے خیاباں میں

خیر مقدم "خیابان"

از سید جالب صاحب دہلوی ایڈیٹر روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ

عزیزی و محبّی سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم۔ اے (علیگ) کی یہ کوشش نہایت قابل قدر ہے اور میں تہ دل سے ان کی کامیابی کا متمنی ہوں کہ وہ ملک کی مشترکہ زبان (اردو) کے عظیم الشان مرکز (بالاشتراک لکھنؤ) سے ایک ایسا ماہانہ رسالہ جاری کرنے کے خواہشمند ہیں جو خصائص ادبی دلچسپیوں کے لئے مخصوص ہو، اور ملک کے سر آوردہ اصحاب و مشہور اہل قلم کی دماغی محنتوں کے نتائج انکے ہموطنوں کی دلچسپی و فائدہ رسانی کے لئے سلیس زبان میں پیش کریں۔ تھوڑے عرصے سے ملک میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے۔ جو محض خیال آرائیوں کو "ادبی خدمت" سے تعبیر کرتی ہے اور ایک ایسا لٹریچر پیدا کر رہی ہے جسکی اگر روک تھام نہ کی گئی تو اسکا قوی اندیشہ ہے کہ وہ نثر اردو کو اسی گڑھے میں لیجا کر گرا دے گی جسمیں اردو نظم کو اس طبقہ شعراء نے گرا دیا تھا جو حقیقی معاملہ بندی اور واقعہ نگاری کے بجائے محض الفاظ کی آراستگی و پیراستگی پر شاعری کو معذور سمجھا تھا، اور دروازہ کی بلی سے "مرغ دل" کو تڑوانا اور ناک کے چوہے سے "رخت جان" کو کتروانا، اعلیٰ درجہ کی مضمون آفرینی میں تعبیر کرتا تھا، ہندوستان میں اردو زبان کی مشترکہ حیثیت و ہر دلعزیزی کا اس سے زیادہ عملی ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اسوقت "کشمیر" سے لیکر "راس کماری" اور "کراچی" سے لیکر "چاٹگام" تک ملک کے طول و عرض میں مختلف مقامات پر اردو کے رسائل و اخبارات شایع ہو رہے ہیں اور بنگلور (میسور) کے مشاعرہ میں جو غزلیں پڑھی جاتی ہیں ان کی داد تحسین کی گونج سرینگر (کشمیر) میں سنائی دیتی ہے لیکن اردو کے حقیقی بہی خواہوں کو یہ دیکھکر سخت صدمہ ہوتا ہے کہ بعض رسالوں میں جو محاسن صوری سے بخوبی آراستہ ہیں بیسیوں صفحات ایسے نام نہاد ادبی مضامین کی نذر کئے جاتے ہیں جسمیں حرف مدعا قدیم شعراء کے معشوق کے دہن و کمر کی طرح غائب ہوتا ہے اور بیان کے الجھاؤ کے ساتھ غریب اردو کو فارسی و عربی کے مغلق الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں سے اسطرح گرانبار کیا جاتا ہے کہ اسکی آبادی کا اہم طبقہ جو ہمارے ہندو بھائیوں پر مشتمل ہے انکو دیکھتے ہی گھبرا اٹھتا ہے۔ اور مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی ایسے مضامین کے مطالعہ سے استفادہ تو کجا، کوئی وقتی دلچسپی بھی حاصل نہیں کر سکتا ہم ہندوؤں کی ایک جماعت سے گلہ مند ہیں کہ وہ ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کی اشاعت کے جوش میں

ملک کے دونوں بڑے فرقہائے آبادی کے درمیان اشتراک زبان کو مٹا رہے ہیں جس کے بغیر ملکی اصلاح و ترقی کی کوئی تدبیر چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی، لیکن اردو کے یہ نام نہاد "معجز نگار" ادیب اُن سے بھی زیادہ ذمہ دار ہیں جو اُردو ملک کی مشترکہ زبان کو ننانوے فیصدی نہیں بلکہ ۹۹۹ فی ہزار اشخاص کے لئے ناقابل فہم بنا رہے ہیں اور مسلمانوں جیسے غریب قوم کے ہزار ہا روپئے ہر مہینے ایسے مضامین کی اشاعت کے لئے کاغذ و سیاہی (بلکہ رنگینی، وغیرہ میں ضایع کر رہے ہیں، جنسے زبان کو فائدہ کی بجائے صریح نقصان پہونچتا ہے۔

میرے عزیز شہنشاہ حسین صاحب رضوی نے مجھے اطمینان دلایا ہے کہ "خیابان" کو اس قسم کی لغویات سے بالکل پاک رکھا جائیگا اور اسکے ہر مضمون سے کسی نہ کسی معاملہ پر اردو خواں طبقہ کو مفید معلومات حاصل ہونگی،

یہ امر قابل مسرت ہے کہ اپنے وسیع حلقۂ احباب ہی میں بیسیوں قابل مضمون نگار انھیں مل گئے ہیں اور ملک کے مشاہیر اہل قلم و رہنمایان قوم سے بھی رسالہ کی قلمی اعانت و سرپرستی کے وعدے وہ حاصل کر چکے ہیں۔ اور انمیں سے بعض وعدوں کے ایفار کی ابتدائی قسطیں بھی اُن کو موصول ہوگئی ہیں، ایسے مفید اور شاندار توقعات کے ساتھ "خیابان" کا اجرا نہ صرف لکھنؤ کے لئے مایۂ ناز و مسرت بلکہ ملک کے لئے باعث تبریک و تہنیت ہے کیونکہ خیابان کی آرایش میں ہندو مسلمان دونو شریک ہیں گے اور اس طرح ہمارے ملک کی اہم ترین ضرورت ہندو مسلم اتحاد کے مقصد کو اس سے بہت بڑی تقویت پہونچے گی۔

سنا جاتا ہے کہ صوبہ ہذا میں لوکل گورنمنٹ کی زیر سرپرستی علمی کاموں کی اعانت و ہمت افزائی کے لئے سرکاری و غیر سرکاری بااثر اصحاب و خادمان ملک و زبان کی ایک مجلس بنام "ہندوستانی اکاڈمی" قائم کی جا رہی ہے اور اسکا افتتاح اس مہینہ (نومبر) میں بمقام لکھنؤ ہونے والا ہے۔ اس مجلس کے قیام کے ساتھ لکھنؤ کے "رسالہ خیابان" کا اجراء خواہ اتفاقیہ ہی، مگر یقیناً ایک فال نیک ہے اور آیندہ اس سے عظیم الشان نتائج مرتب ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

میں اپنی اخباری بیلک مصروفیتوں میں اسوقت صرف ان چند سطور کے لکھنے کا موقعہ پا سکا ہوں اور اپنے عزیز شہنشاہ حسین صاحب رضوی سے معذرت خواہ ہوں۔ آیندہ نمبر کیلئے انشاء اللہ کوئی مضمون حاضر کرونگا۔

عذرِ گناہ اردو رسائل کی تعداد اب کسی اضافہ کی ہرگز متحمل نہیں، ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں جہاں اُردو بولی جاتی ہو اَدَبی ذوق بھی دبی ہوئی آگ کی طرح موجود ہو، یہ مذاقِ سلیم ہو یا کیا؟ لیکن اس سے انکار کرنا ذرا آسان نہیں کہ ہمارے کثیر التعداد رسائل نے بحیثیت مجموعی وہ نہیں کیا جو انکا نصب العین تھا یا ہونا چاہئے تھا منزلِ مقصود کیا تھی اور بھٹک کدھر گئے؟ خودرو درختوں کی طرح ہمارے اُردو رسائل بھی ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن مصرِ ادب میں ان انمول یوسفوں کا خریدار کون؟ اس کساد بازاری میں جنس گراں پیش کرکے حسرت کشِ نظرِ التفات ہونا گناہ اور عذرِ گناہ نہیں تو اور کیا ہے؟

لیکن خیابان کا مقصد ادبی خدمت کی آڑ میں نہ زبان کُش انوکھی شاعری کا طبل شہرت بجانا ہو نہ ادب سوز اُردو کی اشاعت، اردو ہمارا پیدائشی حق ہے، اور اسی حق کی حفاظت ہمارا فرض اولیں ہو یہ کیونکر اور کس طرح؟ یہی خیابان کا دائرہ عمل ہو، اُردو اسوقت تہی دست ہو، جو کچھ اسکے پاس تھا وہ یا تو اب اسکے پاس نہیں ہے۔ اگر ہو تو "گنج پنہاں"۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم اپنی زبان کے دامن کو علوم مشرقیہ و مغربیہ کے جواہر سے بھر دیں، یا اسکے مدفون خزانہ کو جوہر شناس نظروں کے سامنے پیش کردیں اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو ہم سمجھینگے کہ ہم نے اس فرض کو جسکا ہماری مادری زبان ہم سے مطالبہ کرتی ہو ادا کر دیا، انشاء اللہ

اردو رسائل کی حالت زار مسٹر ڈاکٹر خسرو اپنے ایک مراسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہم کو پانچ چار سال میں یہ تجربہ ہوا ہے کہ اردو رسائل کی پیدائش میں تو کمی نہیں ہو لیکن نشونما سے پیشتر ہی انکی حیات ختم ہو جاتی ہو اگر کچھ عرصہ زندہ بھی رہے تو نیم جانی کے ساتھ۔ . . . . . .
. . . . ." مجھکو یہ بھی اردو رسالوں سے شکایت ہو کہ اُنمیں ہر کس و ناکس کے اشعار گل و بلبل یا دخترِ رز کی بے عنوانیوں کے متعلق شایع ہوتے ہیں اس سے نہ اردو کو کوئی فائدہ ہوتا ہے نہ مذاق سلیم کی ترقی تاریخ و روایت و قصہ میں مطلق فرق نہیں کیا جاسکتا . . . ."

ایک انصاف پسند دل فاضل ڈاکٹر کی قابل قدر رائے سے اتفاق کیے بغیر نہیں رہ سکتا سچ تو یہ ہو کہ اردو رسائل

کی حالت اسقدر زبوں ہو چکی ہے کہ اب اسکا اندازہ کرنا بھی آسان نہیں "۔ خود موصوف ہی کے الفاظ ہیں :-

"کیا وجہ ہے کہ اردو میں اس شان کے ماہواری رسائل شایع ہو سکیں جیسے کہ انگلستان میں"

خیابان کی بزم تحقیق ہم کو اعتراف ہے کہ ہم نے "خیابان" کے لئے قلمی اعانت حاصل کرنے میں خود بخل کیا ہے اور صرف اُن مشاہیر ارباب قلم کی خدمت میں التماس کی جرأت کی ہے جو ملک قوم زبان اور ادب کے لئے مایۂ افتخار ہیں ایک اُردو رسالہ کی تکمیل یوں بہت آسان ہے لیکن ناموافق مزاج غذائی مضامین سے جو جراثیم پیدا ہوتے ہیں اُنسے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہماری ادبی فضا کو مسموم نہ بنا دیں

ہم اُن حضرات کے یقیناً رہین منت ہیں جنھوں نے ملک کیلئے ایک اُردو "سرتج" (محققانہ) رسالہ کی ضرورت کا احساس کر کے اسکو کامیاب بنانے میں ہماری حوصلہ افزائی کی ہمکو کامل وثوق ہے کہ انکی دلچسپی "خیابان" سے ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہے گی۔

اخلاقی تعلیم کیلئے ایک عالمگیر دستور العمل کا امکان عنوان بالا سے کسی دوسرے مقام پر ان صفحات میں علامہ عبداللہ یوسف علی ایم اے (آکسن) ایل ایل ایم۔ آئی سی ایس سی۔ بی۔ ای بیرسٹر ایٹ لا و پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کا وہ محققانہ مضمون شایع کیا گیا ہے جو موصوف نے بین الاقوامی کانگرس تعلیم اخلاقی کے اجلاس چہارم منعقدہ رومتہ الکبریٰ کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ مسٹر عبداللہ یوسف علی جیسا کہ موصوف اپنے مضمون کا تعارف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "اُن دو مضمون نگاروں میں سے ایک ہیں جنکو دنیائے مشرق سے منتخب کیا گیا ہے، پروفیسر آرسٹینو" دوسرے مضمون نگار ہیں جو اپنے مضمون میں فلسفہ مغرب کی اپنے قابل قدر معلومات پیش کرینگے" علامہ یوسف علی نے موضوع مقررہ پر مشرقی نکتہ نظر سے بحث کی ہے۔

ناقابل تلافی فروگذاشت ہوگی اگر ہم اس موقع پر مسٹر عبداللہ یوسف کا شکریہ ادا نہ کریں موصوف نے شایع ہونے سے پیشتر ہی مضمون ہم کو مرحمت فرما دیا اور ہم کو اجازت دیدی کہ ہم اس کا جس طرح چاہیں استعمال کریں

اُردو رسائل کیلئے ایسی محققانہ مضامین قابل افتخار ہیں اور ہم کو مسرت ہے کہ ہم اپنی پہلی اشاعت میں ایسا گراں بہا مواد فراہم کر سکے۔

تنقید و منقید رسالہ "معیار" کے ایک قدیم اشاعت میں مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی اپنے مضمون

"عالم ارواح کا شاعرہ" کے تحت میں حضرت تعشق مغفور کے کلام پر تبصرہ فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

"شعرائے لکھنؤ کے آخری دور میں تعشق ہی کی وہ ذات ہے جسکو شعرائے دہلی کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے"

ان الفاظ نے بدقسمتی سے بہت کچھ غلط فہمی پیدا کردی تھی جو شاعرانہ نوک جھونک پر مبنی خیال کی جاتی تھی ان تمام باتوں سے قطع نظر کرکے دیکھنا یہ ہے کہ لکھنؤ کے ارباب سخن کے قلوب میں تعشق کی کسقدر جگہ تھی، تعشق کی وفات کو ایک ثلث صدی سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے لیکن نہ معلوم اس سحر بیان نے کیا جادو کیا ہے کہ لکھنؤ کے سخن سنج اب بھی تعشق کے نام پر سر دھننے لگتے ہیں۔ دیوان کا ایک مختصر انتخاب غالباً ۱۹۰۶ء میں آبر مرحوم اور حضرت عزیز لکھنوی کی مساعی سے شایع ہوا تھا لیکن یہ صرف غزلیات کا مجموعہ تھا[٥١]۔ اسمیں رباعیات، قطعات، سلام، مراثی کا کہیں نام بھی نہیں، ہماری بدنصیبی ہے کہ لکھنؤ کے صاحبان ذوق میں سے کسی نے انکے کلام کے مجموعہ پر تنقید کرکے شایع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہمارے اصرار سے جناب مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ خیابان کی آیندہ اشاعت سے "تعشق" پر ایک محققانہ سلسلہ شروع کرسکیں گے جو انشاء اللہ بعد ختم ایک کتاب کی صورت میں شایع کردیا جائیگا، خدا کرے کہ ہم اس کوشش میں کامیاب ہوسکیں

عربوں کا ذوق موسیقی کون کہہ سکتا ہے کہ عرب فنون لطیفہ سے ناآشنا تھے ؟ بدقسمتی سے اب ہمارے پاس کچھ نہیں، جس سے ہم اپنے دماغی تمول کا ثبوت دے سکیں، جو کچھ تھا وہ دوسری قوموں کی اب ایسی گرانبہا دولت ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی ممکن نہیں، زمانہ تو یہ سمجھتا ہے کہ اس جنگجو قوم کے دنیاوی کارنامے صرف فاختہ کے ایک انڈے پر چالیس چالیس سال تک خون کی ندیاں بہانے تک محدود ہیں[٥٢]، اسمیں فنون لطیفہ کا ذوق سلیم کہاں ؟ قیاس صحیح ہوسکتا ہے اور ہونا چاہیئے لیکن غلط فہمی صرف اسقدر ہے کہ جس چیز کو ہم جہالت سے تعبیر کرتے ہیں وہ فن سپہ گری کے خلقی کمال کا نام ہے اسکے ساتھ فنون لطیفہ اور بالخصوص موسیقی کا ذوق عربوں کے نہ صرف متمدن ہونے کا ثبوت ہے

---

٥١ حضرت تعشق کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ وہ جتنی مرتبہ زیارت عتبات عالیات کو تشریف لے گئے اپنے دیوان کو بھی ساتھ لیتے گئے اور جہاز پر بیٹھکر اسکو سمندر کی ناقدرشناس موجوں کے نذر کرتے آئے اگر یہ قصہ صحیح ہے تو یہ مجموعہ یقیناً ان غزلیات کا ہوگا جو موصوف نے آخری بار زیارت سے مشرف ہونیکے بعد اور اپنی وفات سے قبل کہی ہونگی، اسوقت جو کچھ کلام موصوف کا ہے وہ نواب سید محمد تقی علی خاں صاحب ساکندر رئیس لکھنؤ کے پاس ہے موصوف کو تعشق سے عشق ہے، اور ان کے کلام کو بہت عزیز رکھتے ہیں ؛

٥٢ قبیلۂ بکر کا مشہور و معروف واقعہ

بلکہ ان کے زندہ و پائندہ ہونے کی یادگار "بوڈلین لائبریری" عربوں کے انمول جواہر کو چھپائے ہوئے ہے۔

"ہنری جی فارمر" جنکو عربوں کے فن موسیقی میں گہری دلچسپی ہے اور ان کے تصانیف میں اچھی خاصی نظر ہے "رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل" کی اشاعت اکتوبر ۱۹۲۵ء میں اپنے ایک پر مغز مضمون میں مختصر فہرست عربوں کی اُن تصانیف کی پیش کرتا ہے جو صرف فن موسیقی پر ہیں۔ مضمون میں ہر تصنیف کے ابواب و فصول پر مجملا بحث بھی ہے جس سے اسقدر اندازہ ضرور ہو سکتا ہے کہ عربوں نے اس فن کا بحیثیت فن مطالعہ کیا تھا، یا یہ انکی اختراعی دماغوں کا کارنامہ تھا کہ یونانیوں کے دوسرے علوم و فنون کیطرح موسیقی کو بھی اسطرح خاک سے پاک کیا کہ آخر کار وہ خود انکی تسلیم ہو کر دنیا کی نظروں میں عزت کی جگہ پانے لگی۔

الف لیلہ و لیلہ کی قدیم تاریخ

ادب عربی کے محققین کو الف لیلہ و لیلہ کی قدیم تاریخ پر روشنی ڈالنے کا ذوق پیدا ہوا ہے مسٹر ڈی۔ بی میکڈانلڈ (ہارٹفورڈ ریاستہائے متحدہ امریکہ) نے ہمیں یاد نہیں یورپ کے کسی علمی رسالہ میں کچھ عرصہ ہوا ایک طویل پر مغز مضمون بھی اس موضوع پر لکھا ہے کھوج اسکی ہے کہ الف لیلہ و لیلہ میں جو بیشمار قصص موجود ہیں اور ہر شب اپنا ایک تازہ افسانہ رکھتی ہے، ان کی اصل کہاں سے ہے، خود شکسپیر کے تقریباً تمام ڈراموں کا پلاٹ نیا نہیں، بلکہ جن متفرق افسانوں کی بنیاد پر اسنے اپنے ڈراموں کی تخیلی عمارت کھڑی کی ہے وہ یا تو قدیم مصنفین و شعرا کی کرم خوردہ نادر الوجود کتب میں پہلے موجود تھے یا اُس عہد میں یا اس سے قبل کسی نہ کسی عنوان سے زبان زد خلائق تھے شیکسپیر کے سر اگر سہرا ہے تو اسکا کہ اس نے "پرانی شراب کو نئی بوتلوں میں بھرا اور پھر ایسا بھرا کہ زبان اور جذبات انسانی پر کامل قدرت رکھنے کی قوت سے ان کو اپنا اور اچھوتا کر دیا"، الف لیلہ و لیلہ کے قصص بھی ممکن ہے کہ جدید ہوں، میکڈانلڈ کی رائے میں ان قصص میں عوام کی معلومات کا عنصر زیادہ ہے اور ان کے بطن میں اکثر ایسی ہی باتیں داخل ہیں جو عربی قبائل میں کافی شہرت رکھتی تھیں اس خیال کی تصدیق میں متعدد شہادتیں پیش کیگئی ہیں جنکی صداقت و غیر صداقت کا دریافت کرنا افسوس ہے کہ اسوقت تک ممکن نہیں جبتک کہ ہماری وسیع نظر اس صنف کے تمام قصص اور بالخصوص وہ قصص یا داستانیں جو الف لیلہ و لیلہ کے پہلے لکھی گئی ہیں محیط نہ کئے ہوئے ہو نہ ایسی داستانوں کا ایشیا کے کسی کتبخانہ میں وجود ہے نہ کسی کی نظر ایسی وسیع پھر جو کچھ میکڈانلڈ نے جدید انکشافات کئے ہوں وہ آمنا و صدقنا، تاہم الف لیلہ و لیلہ کے صفحات پر ایک

سرسری نظر بھی بتلائے گی کہ اسکے قصے قدیم ہوں یا جدید لیکن انمیں ندرت اور دور کی کوڑی لانے والی تخیئل کی قوت ضرور نمایاں ہے

اردو خطوط

آج سے تقریبًا ایک صدی قبل ڈی کوئنسی .De Quincey نے حسرت ظاہر کی تھی کہ افسوس خط لکھنے کا فن انگلستان سے اٹھ گیا ہم اُردو خطوط کے لئے کوئنسی کے الفاظ عاریۃً لیتے ہیں اور اشک حسرت بہاتے ہیں کہ اُردو خطوط کا لطف غالب مغفور کے ساتھ رخصت ہوگیا؛ انگلستان میں خط لکھنا ایک فن تھا لیکن ہندوستان میں خطوط نویسی کو فن بنانے میں کوشش نہیں کیگئی، سبب ظاہر ہے حکومت کی دفتری زبان فارسی تھی جس کی وجہ سے عمال و تعلیم یافتہ طبقہ کو فارسی میں خط لکھنا پڑتے تھے، ابتک قدیم وضع کے پرستار اردو میں خط لکھنا معیوب سمجھتے تھے' علیت کا اندازہ فارسی و عربی کی اعلی قابلیت پر کیا جاتا تھا' نہ کہ اردو ادب کی قوت پر افسوس ہو کہ اُردو نے فارسی کو اسوقت مغلوب کیا جبکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا، غالب سے پہلے سودا، انشا و نیز دیگر شعراے اُردو کے خطوط ملیں گے لیکن یہ خطوط نہ اردو میں ہیں نہ فارسی میں" فارسی کے عنصر کو اسقدر غلبہ ہو کہ صرف ہست نیست بود کی کسر باقی رہتی ہے، غالب مرحوم اس فن کے موجد تھے اور افسوس ہے کہ وہ اپنے ساتھ اس فن کو لے بھی گئے۔ ان کے بعد بقول حالی آخری دور میں تقلید کے سوا نہ ہی کیا تھا۔ تمام اہل کمال ایک ایک کرکے اٹھ چکے تھے کچھ لوگوں نے موجد فن کی تقلید کرنا چاہی مگر وہ بات کہاں' وہ لطف کہاں' خطوط شاعرانہ مضامین ہو کر رہ گئے' خط کا جوہر تو یہ ہے کہ یہ معلوم ہو کہ دو آدمی بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں؛ جو زبان بولی جائے وہی لکھی بھی جائے۔ تحریر میں تصنع لطافت کو کھو دیتا ہے' کناڈین Canadian روزنامہ گریفک میں لکھتا ہو "خط کے لکھنے والا شاندار لباس میں تو ضرور ظاہر ہونا چاہیئے لیکن وہ شاندار لباس ایسا نہو کہ وبال جان معلوم ہوتا ہو" خط اور مضمون میں خط تفریق نمایاں ہونا چاہیئے مضمون کا مخاطب ایک شخص نہیں اسکا خطاب عوام سے ہے' اردو خطوط میں نقص ہو تو یہی: خط میں کوئی لفظ کوئی جملہ خلاف واقعہ نہونا چاہیئے اُردو میں ایک دوست اپنے دوسرے دوست کو "ڈیر' یا پیارے" سے کبھی نہیں خطاب کرتا، لیکن افسوس ہو کہ انشا پردازی کا دعوی کرنے والے اپنے دوستوں کو بلا تامل' ڈیر یا پیارے' لکھ دیتے ہیں' غنیمت ہیں وہ بڈھے جو ابھی تک اپنی آن' بان

سنبھالے جاتے ہیں، ان کے خطوط شفقت آمیز، پر جذبات، سیدھی سادی روزمرہ میں وہ پر زور اثر پیدا کر دیتے ہیں
جو محبت کا دم بھرنے والے پر جوش الفاظ نہیں کر سکتے۔

انگلستان کی مذہبی بے اعتقادی نیشن (Nation) لندن کو بھی خوب سوجھتی ہے، حال میں اُس نے اپنے ناظرین سے کچھ استفسارات کئے ہیں جن کا مقصد انگلستان کی تعلیم یافتہ حلقوں میں عیسائیت کے عقیدہ کی گہرائی کا دریافت کرنا ہے۔ ان کے جوابات بہت دلچسپ ہیں جو "نیشن" تو منہ کی کھا کے خاموش ہو جاتا ہے، لیکن لورپول پوسٹ (Liverpool Post) کے پیٹ میں چوہے چھوٹتے ہیں، جو گلفشانیاں اُس نے کی ہیں وہ سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہیں، ان استفسارات کو مع جوابات کے درج ذیل کرتے ہیں:۔

سوالات	جوابات: اثبات	نفی	مشکوک
(۱) کیا آپ خدا کے قائل ہیں!	۵۳۷	۷۳۶	۶۵
(۲) کیا آپکا عقیدہ ہے کہ مادہ ہر چیز کا مبدا وجود ہے؟	۳۷۹	۷۶۲	۱۹۷
(۳) کیا آپ کا عقیدہ ہے کہ مسیح میں وہ الوہیت موجود تھی جو کسی دوسرے انسان میں نہیں تھی؟	۴۷۴	۸۱۹	۴۵
(۴) کیا آپ کسی قسم کی مسیحیت کے معتقد ہیں؟	۶۶۶	۵۸۵	۲۷
(۵) کیا آپ کسی چرچ کے قواعد و ضوابط کے معتقد ہیں۔	۳۲۵	۹۲۰	۹۳
(۶) کیا آپ کسی چرچ کے ممبر ہیں	۴۴۵	۸۳۶	۲۶
(۷) کیا آپ بہ رضامندی کسی چرچ کی مراسم عبادت (وغیرہ) میں شرکت کرتے ہیں؟	۵۷۱	۷۴۲	۲۵
(۸) کیا آپ عہدنامہ قدیم کے پہلے باب کو تاریخی تصور کرتے ہیں	۹۸	۱۲۱۶	۲۴
(۹) کیا آپکا عقیدہ ہے کہ انجیل المقدس اس معنی میں الہامی کتاب ہے جس معنی میں دوسری کتابیں نہیں ہیں؟	۳۷۷	۹۱۸	۴۳

(۱۰) کیا آپ کا عقیدہ ہے کہ قدرت ہمارے خیالات پر کوئی اعتنا نہیں کرتی .... اثبات ۴۲۹ نفی ۴۱۵ مشکوک ۲۳۰

سوالات اور ان کے ساتھ جوابات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ سوائے سوال نمبر ۲ کے جسمیں اثبات کی آرا (۶۶۶) ہیں اور نفی (۵۸۵) ہر ایک میں غلبہ نفی ہی کو ہے۔ یہ جہلا کے جوابات نہیں بلکہ روشن دماغ طبقہ کے جوابات ہیں "نیشن" کے قارئین جیسا کہ لورپول پوسٹ کا خیال ہے جاہل نہیں ڈین انجی اپنی ایک جدید تصنیف میں لکھتا ہے (Dean Inge.) عیسائیت جمہور انگلستان میں کبھی بھی مقبول نہیں ہوسکتی، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کونسی عیسائیت ہے جسکے لوگ معتقد ہیں

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود،
پھر یہ ہنگامہ اے خدا، کیا ہے؟ (غالب)

باقی دارد "باقی دارد خیاباں کے لئے کلنگ کا ٹیکا خیال کیا جاوے یا اس کا طغرائے امتیاز، ہم اس کے لئے کوئی معذرت پیش کرنا نہیں چاہتے، حقیقت یہ ہے کہ ایک محققانہ رسالہ کے لئے مختصر مضامین حاصل کرنا اس کے مقصد کو دراصل فوت کرنا ہے۔ نہ ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ دریا کیونکر کوزے میں بند کیا جاسکتا ہے۔ بہرکیف کچھ بھی ہو ہمارا عقیدہ ہے کہ ہم حق بجانب ہیں اور ہم امید کرتے ہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے ناظرین دوسرے ادبی رسالوں کے "عشقیہ" مضامین کے بجائے خیاباں کے "عالمانہ" مضامین کے طویل سلسلوں سے اپنی وابستگی کو برقرار رکھیں گے۔

انشاء اللہ تعالیٰ

اخلاقی تعلیم کیلئے ایک عالمگیر دستور العمل کا امکان

بقلم مسٹر عبد اللہ یوسف علی ایم اے (آکسن)، ایل۔ ایل۔ ایم۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ای۔ پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

بین الاقوامی کانگرس تعلیم اخلاقی (International moral Education Cong) نے اپنے سالانہ اجلاس ۱۹۲۶ء رومتہ الکبری کے لئے دو خاص مباحث تحقیقات غور و مباحثہ کے لئے تجویز کئے ہیں، اور اسکے ساتھ یہ بھی تجویز ہوا ہے کہ ہر موضوع پر ایک ایک شخص مضمون لکھے اور پھر مجلس عاملہ کی منتخب کردہ نقاد انپر اپنی تنقید پیش کریں، مجھے یہ عزت دی گئی ہے کہ مذکورہ بالا مضمون نگاروں میں ایک میں ہوں اور میں اپنا مضمون "اخلاقی تعلیم کیلئے ایک عالمگیر دستور العمل کا امکان" پر پیش کروں میرے دوسرے لائق رفیق پروفیسر اسٹینور (   ) ہیں جو اپنے مضمون میں فلسفہ مغرب پر اپنی گہری معلومات کو پیش کرینگے، میں اس موضوع پر مشرقی نکتہ نظر سے روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

عبد اللہ یوسف علی

مشرقی و مغربی نکات نظر ایک عالمگیر اخلاقی دستور العمل جیسے عام دلچسپی کے مسئلہ میں مشرقی و مغربی نکات نظر کے درمیان خط تفریق کھینچنا ناممکن ہے میں اس مبحث پر ایک اجمالی نظر ڈال رہا ہوں اور اپنے ناظرین کرام سے ہرگز یہ نہیں توقع کرتا کہ وہ مجتہدین علم اخلاق کے کثیر التعداد تصانیف پر عبور رکھتے ہونگے تاہم میرا فرض ہے کہ دیدہ دانستہ یا روا روی میں مجھ کو اپنی مشرقی طرز زندگی کے اخلاقی، مذہبی، تمدنی، سیاسی اور تعلیمی تجربہ کو ضرور کام میں لاؤں اور یہ اس بین الاقوام کانگرس کے واسطے جو تعلیم کا ایک عالمگیر ضابطہ اخلاقی تیار کرنا چاہتی ہے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ہم کو اب علمی تنقیحات پر نظر ڈالنا چاہیئے اگر وقت اور جگہ کا زیادہ خیال نہ ہوتا تو اس مضمون پر کافی روشنی ڈالنے کے واسطے تاریخ پر ایک عمیق نظر اور تاریخی واقعات کا ایک مفصل تذکرہ ضروری تھا اور اس سلسلہ میں اپنیشد و دیگر قدیم ہندوستانی فلسفیانہ تصانیف علم الاخلاق اور علم الموجودات پر عربی و فارسی زبان میں صحیح

کتب اسلامی ہندوستان جاپان اور سیلون کے بودھ مذہب کے علماء کے خیالات فلسفۂ لیفیوشس لاؤ ٹیس و شنیازم اور بوشیڈو کا اقتباس کیا جاتا۔ تاہم صرف تاریخ مغربی کے دروازہ تک پہنچنے اور اتنا کرنے پر بھی ہمارا کام نصف بھی نہ تمام ہوتا کیونکہ اسکے بعد موجودہ زمانہ کے تحریکات کو جو ایشیا میں نہایت زور کے ساتھ موجزن ہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس کام کے واسطے برسوں اور ان خیالات کے واسطے جلدیں درکار ہیں جو اس موقع اور اس مختصر مضمون کے لکھنے میں خارج از بحث تھیں۔ لہٰذا ہم کو عملی تنقیحات پر نظر رکھنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ یہاں تک ہماری بحث ان اخلاقی تعلیمی تحریک میں جس کو اس کانگرس نے اٹھایا ہے مفید ثابت ہو سکتی ہے یا نہیں؟

فلسفہ اخلاق عملی طریق عمل

مگر عملی تنقیحات پر نظر ڈالنے کے یہ معنی نہیں کہ تخیل کو بالکل کام میں نہ لایا جائے ہندوستان و دیگر مشرقی ممالک میں بنسبت مغرب کے تخیل و خیالات کی زندگی و طرز زندگی پر زیادہ اثر پڑتا ہے لیکن اگر ہم عقل سے کام لیں تو چند عالمانہ مغالطوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں اس قسم کی غلطی کے ارتکاب کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بیسویں صدی کے ایک ہندوستانی دماغ میں وہ متصادم خیالات آ جاوینگے جنکا مبدا بھگوت گیتا ہے یا اناطولیہ عراق شام کے سیدھے سادھے مسلمان کے دماغ میں جو اپنے مذہبی طریقہ عمل میں اصلاح کرنا چاہتا ہے اس غلطی سے مولانا جلال الدین رومی کے صوفیانہ خیالات کو الغزالی و ابن رشد کے تصانیف علم الموجودات سے مقابلہ کرنے کا خیال پیدا ہوگا۔

اس موقع پر یہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ فلسفہ و علم الاخلاق مغرب کی تاریخ ایک رشتہ ہے جو مغرب سے زیادہ مشرق پر اپنے گہرے اثرات ڈالتی ہے اس خیال کے ماتحت میری کوشش ہوگی کہ میں بجائے ان طرز کے جو کتابوں کے تسکم میں محفوظ ہیں ان تو موں او تحریکات پر زور دوں جو دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں

ایک عالمگیر ضابطہ اخلاقی کیا چیز ہے؟

ایک عالمگیر ضابطہ اخلاقی کیا چیز ہے؟ اور کیا اسکا امکان ممکن ہے؟ ہماری تشفی ہرگز ایک باقاعدہ تحریری ضابطہ مثلاً جناب موسیٰ[1] کے دس احکام کے مجموعہ سے جو قانون بنگیا تھا اور رائج کر دیا گیا تھا نہیں ہو سکتی یہ بہت حقیر بنیاد ہوگی۔ موجودہ اقوام عالم کا قانون ایسی حقیر بنیاد پر نہیں ہو سکتا۔ نہ مختصر مواقعات و ہدایات مثلاً "تجھکو قتل کرنا نہ چاہیے" ہم کو ایسے مسائل کے حل ہیں جیسے گوشت کے لئے جانوروں

[1] جناب موسیٰ کے دس احکام جو خدا کی طرف سے ان کو ملے تھے۔

کا ذبیحہ مسلم شدہ حق دفع انسانی فیصلہ کے مطابق از روئے قانون کی جان لینا۔ یا باقاعدہ سپاہ سے جنگ میں محافظت
کرسکنا یا نہ کرسکنے میں معین نہیں ہو سکتے۔ نہ ہم اپنے ایسے اخلاقی ضابطہ سے یہ مراد لے سکتے ہیں کہ وہ رُوحانی ہدایات
کا ایک ایسا ضخیم مجموعہ ہوگا جیسا مواعظہ کوہی[۵۰] جس پر آج تک اسکا کوئی معتقد کبھی عمل پیرا نہیں ہوا۔ کیا ہم یہ سمجھتے
ہیں کہ ہمارا ضابطہ اخلاقی بوشیڈو کا جاپانی ضابطہ اور دور وسطی کے یورپ کا قانون سپہ گری یا امریکہ کا مشہور ضابطہ
کیو کلکس کلن یا متعدد دوسری غیر تحریری ایسی روایات یا قوانین کی طرح ہوگا۔ جو مختلف اوقات میں مخصوص حالات
کے ماتحت مخصوص لوگوں میں رائج ہوتے رہے ہیں۔

اس انداز سے سوال کرنے میں جواب خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ ایسے محدود ضوابط ہرگز عالمگیر نہیں قرار
پا سکتے۔ ایسے ضوابط میں ایک فلسفیانہ مسئلہ مضمر ہے جس سے ایسے نکات پیدا ہوتے ہیں جو مخصوص حالات کے
احاطہ کے باہر نکتہ چینی اور اختلافات کو خود اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ کیا ہم ایک عالمگیر معیار قائم کر سکتے ہیں جس کو
دنیا کے ہر دور ہر حالت اور ہر قوم کے افراد کے ضمائر پسندیدگی کی نظروں سے دیکھیں؟ مخصوص طبقوں میں جو روایات
رائج ہیں اگر ہم ان کے اسباب پر غور کریں اور ان کی بنیاد کی تحقیق کریں تو ہم محسوس کرینگے کہ اگر ہم ذرا بھی ان کو ایک
عالمگیر کسوٹی پر کسنا چاہینگے تو انکا سارا فلسفہ باد ہوا اور انکی حقیقت عریاں ہو جائے گی۔ ہم کو اس مسئلہ پر دوسرے
نکتہ نظر سے روشنی ڈالنا چاہیئے۔

ایک شریف آدمی کا رکھ رکھاؤ | سر فرانسس ینگ ہسبنڈ[۵۱]
جو ہماری بین الاقوامی مجلس عاملہ کے صدر ہیں ایک زینہ اور بلند ہو جاتے ہیں وہ معاشرتی رکھ رکھاؤ کو تمام قوم اور ہر
طبقہ کے افراد کا حق سمجھتے ہیں۔ میں انکے استدلال کو اُن ہی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

"ایک شریف آدمی کو کیا کرنا اور کیا نہ کرنا چاہیئے یہ کہیں بھی منضبط نہیں ہے تاہم یورپ ایشیا و نیز دنیا
کے ہر ملک کے افراد میں تقریباً غیر منضبط اُصول موجود ہیں اور انہی عامل ہر مقام پر شریف لوگ خیال کیئے جاتے ہیں
خواہ انہیں غربا ہوں یا رؤسا، مہذب و تربیت یافتہ ہوں یا وحشی و بہائم صفت تو کیا اخلاقی معراج پر پہونچنے کیلئے

۵۰ Sermon on the mount.

۵۱ Sir Francis younghusband.

لیسے ہی ضوابط کی پابندی ضروری ہے؟ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹے پیمانہ پر ایک غیر منضبط قانون ضرور موجود ہے جو ہر جگہ رائج ہو گیا ہے۔ یہ نکتہ کسی قدر وضاحت طلب ہے، دنیائے اینگلو سیکسن میں کچھ الفاظ و فقرات ہیں جو عام استعمال میں مخصوص مفہوم رکھتے ہیں۔ مثلاً شریف آدمی وغیرہ ایسے الفاظ کا مفہوم اینگلو سیکسن دنیا میں یہ لیا جاتا ہے کہ بہترین افراد میں وہ تمام خصوصیات موجود ہونگی جنکو لفظ "شریف آدمی" ظاہر کرتا ہے، اس نکتہ کے تسلیم کرنے میں کسی قدر تامل ہے لیکن سرفرانسس اس موقع پر ہماری توجہ کو ایسے زبردست اصول اخلاق کی طرف منتقل کر دیتے ہیں جنپر اکثروں کو اتفاق ہے لیکن خشک اخلاقی اصول ہی ہمارا ضابطہ نہیں ہیں۔

راہ راست پر کون ہے؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ جو لوگ انکار کرتے اور جو لوگ اقرار کرتے ہیں کہ کوئی ملک قوم ہو کچھ بھی حالات ہوں ہر جگہ شریف آدمی ایک سا ہی ہوتا ہے دونوں اپنے اپنے مقام پر سچے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ دونوں ایک لفظ کو مختلف مطالب کے لئے استعمال کرتے ہیں، جو لوگ انکار کرتے ہیں وہ چھوٹے چھوٹے اتفاقی معاملات کا خواہ وہ اخلاقی حیثیت سے متصادم ہوں جیسے کھاتے وقت کسی خاص تراش و وضع کا سیاہ کوٹ پہننا، خواہ وہ قابل اعتراض ہوں مثلاً ایک افسر اور ایک شریف آدمی کی شان سے بعید طرز عمل حوالہ دیتے ہیں، جو اقرار کرتے ہیں وہ بے غرض۔ ہمدردی اور لطف کو مدنظر رکھتے ہونگے

وہ لوگ جو شریف آدمی کے عالمگیر مفہوم سے انکار کرتے ہیں ممکن ہے کہ وہ اسکے پسندیدہ اوصاف کا تصور کرتے ہوں لیکن یہ بلا تامل کہا جائے گا کہ وہ الفاظ کے جال میں گرفتار ہیں، لفظ "کھلاڑی" وغیرہ کے انگریزی مفہوم میں ممکن ہے بعض وہ اخلاقی صفات موجود ہوں جو دوسری اقوام میں نہ پائی جاتی ہوں لیکن یہ کوئی دعوی نہیں کر سکتا کہ ایسے صفات صرف اینگلو سیکسن قوم کے لئے مخصوص ہیں۔ وہ قومیں جو دوسرے ملکوں میں آباد ہیں اور جو دوسری زبانیں بولتی ہیں کیا یہ ممکن نہیں کہ انمیں وہ صفات نہ پائے جاتے ہوں لیکن وہ اقوام جنمیں اینگلو سیکسن قوم کی طرح کھیل کود زیادہ رائج نہیں۔ وہ "کھلاڑی" کے مفہوم کو دوسرے الفاظ سے ظاہر کرتے ہیں۔ لفظ "شریف" کا مفہوم اپنے تمام مفہوم کے ساتھ اینگلو سیکسن قوم کی خصوصیات میں چند خاندانوں قبل داخل ہوا لفظ کا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ بعض مخصوص اوصاف ایک مخصوص طبقہ کی ملکیت نہیں، اور ان میں

۵۱ Anglo-Saxons.

کمتر طبقوں کا کوئی حق نہیں تھا، اسی طرح انگلستان میں کنزرویٹو[1] یعنی سلامت روی کی رفتار پر قائم پارٹی شریف پارٹی کے نام سے موسوم تھی، اور شوشلسٹ[2] اسی طرح نشان ملامت تھے، جس طرح آکسفورڈ مینرس[3] الفاظ آکسفورڈ تہذیب جنکو آکسفورڈ والے استعمال کرتے وقت اخلاق و بہادری پر مشتمل خیال کرتے تھے اور دوسرے مقام والے انہیں حقارت اور تکبر کا شائبہ پاکر بری نظروں سے دیکھتے تھے

(باقی آئندہ)

---

[1] Conservative. [2] Socialists. [3] Oxford manners.

پیامِ علامہ اقبال

ترا نادان! امید غمگساری ہا ز افرنگ است
دل شاہیں نہ سوزد بہر آں مرغی کہ در چنگ است

پشیماں شو اگر لعلے ز میراث پدر گیری
کجا عیش بروں آوردن لعلے کہ در سنگ است

سخن از بود و نابود جہاں با من چہ می گوئی؟
من ایں دانم کہ من ہستم ندانم ایں چہ نیرنگ است

خودی را پردہ می گوئی؟ بگو من با تو ایں گویم
مزن ایں پردہ را چاکے کہ داماں نگہ تنگ است

غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند
چہ آید زاں غزل خوانی کہ با فطرت ہم آہنگ است

اقبال

تازہ کلام نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ مولوی سید علی حیدر صاحب نظمؔ طباطبائی

گذرتے ہیں تو مثلِ سیلِ عالم سے گذرتے ہیں
ٹھہرتے ہیں تو مثلِ نقش پانی پر ٹھہرتے ہیں

صبا کی طرح پھیرا کوچۂ ہستی کا کرتے ہیں
کہ آزادانہ آجاتے ہیں مستانہ گذرتے ہیں

نظر سے مار یہ حسرت نفس آستین تہمت
کوئی مرنے سے ڈرتا ہوگا ہم جینے سے ڈرتے ہیں

مروت تو یہی کہتی ہے بیدردی نہیں اچھی
ادا سمجھائے جاتی ہے کہ مرنے دے جو مرتے ہیں

حباب اُٹھکر قعرِ بحر سے تا سطحِ آب آیا
اُبھرنے والے جو ہیں ناتواں ہو کر ابھرتے ہیں

رہینِ منتِ ہستی کیا تو نے مگر یارب!
لگا دیتے ہیں تہمت جی سے چھٹ جا جینے دھرتے ہیں

بڑی مشکل سے ٹوٹی، پھر بھی ٹوٹی توبہ زاہد
شکستِ سنگ کا الزام سب شیشہ پہ دھرتے ہیں

مزاجِ زیست سے آب ہوا یہ ناموافق ہے
کہ گرمی سے پگھل جاتے ہیں سردی سے ٹھٹھرتے ہیں

کسی کا عکسِ رخ آئینہ میں آکر یہ کہتا ہے
کہ آنکھوں میں سما کر اس طرح دل میں اترتے ہیں

دیے ہوں دل پہ جب چرکے صفائی پھر کہاں ممکن
کہیں داغ مٹتے ہیں کہیں زخم بھرتے ہیں

اگر فقر و غنا کے مسئلہ کو غور سے دیکھیں
تو سچ یہ ہے کہ دونوں لفظ بمعنی ٹھہرتے ہیں

بری عادت نگیں سے سیکھ لی ہے نکتہ چینوں نے
کہ جس پر آنکھ پڑ جاتی ہے اُسکو نام دھرتے ہیں

نہیں ڈرتے زمانہ جتنا چاہے امتحاں کر لے
کھرے ہوتے ہیں جو وہ آگ میں گر کر نکھرتے ہیں

پرائے دل کی حالت کو کوئی اے نظمؔ کیا جانے
سمجھتے ہیں جو ہم دل پہ اپنے ہاتھ دھرتے ہیں

سلطنت دہلی دور وسطیٰ کے آغاز میں

نوشتۂ مسٹر محمد حبیب بی۔اے (آکسن) ایم۔آر۔اے۔ایس بیرسٹرایٹ لا پروفیسر سیاسیات و تاریخ
مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۱)

بادشاہ

دور وسطیٰ کی حکومت ایسے اجزا سے مرکب تھی جسکے عناصر مختلف ممالک سے بہم پہونچائے گئے تھے سلطان اور اسکے ارکان حکومت ایرانی صنم پرست فضا کے پروردہ تھے۔ انکی طاقت کی پشت پناہ وہ سپاہ تھی جسکی تنظیم ترکوں اور مغلوں کے پرانے ڈھرے پر ہوتی تھی اور اس اسٹیج کے پیچھے ہماری نظروں سے پوشیدہ ہندو حکومت کی مٹتے ہوئے آثار تھے جو شاید آریوں کی ہندوستان میں پہلی نوآبادی کے ساتھ قائم ہوئے تھے۔

دور وسطیٰ کے تاجداروں کا اقتدار ہمارے ملک کی تاریخ میں خود ایک مستقل باب ہے، قانون اسلام میں سلاطین کی کوئی جگہ نہیں دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ "سلطان" بحیثیت سلطان اسلام میں کوئی شخصیت نہیں، اسلام کا قانون صرف ایسے خلیفہ سے تعلق رکھتا ہے جو اپنی حیات بھر کے لئے مقرر ہوا ہو۔ خدا اپنے رسول سے ارشاد فرماتا ہے "اپنے معاملات میں مشاورت کرو" کس سے؟ بیشک محکومین (امت) سے گویا خلیفہ کی قوت و اقتدار کا مبدا خود امت تھی، خود ہندوؤں کے قدیم نظریہ سیاسی کے مطابق ایک مطلق العنان خودسر بادشاہ کا کہیں وجود نہیں، ایک ہندو راجہ یا تاجدار کے اختیارات قدیم رسوم و روایات کے حدود میں تھے، اسکو صرف اسقدر اقتدار حاصل تھا کہ وہ اپنے ان احکام کے عملدرآمد میں جو مختلف عمال کے توسط سے انجام پاتے تھے اپنی حسب خواہش منسوخ یا منظور کرنے کے اختیار کو استعمال کر سکتا تھا۔

لیکن شاہان دہلی کے اقتدار کے پیروں میں کوئی زنجیر نہ تھی۔ عملی بندشیں ضرور تھیں مثلاً ہنگامہ آرائیاں بغاوتیں، سازشیں۔ اور ہاں سب سے زیادہ شورش پسند خلقت کے شمشیر بکف اٹھ کھڑے ہوجانے کا خوف،

یہ وہ خلقت تھی جو آناً فاناً میں نہ راسی آتش افروزی پر سلطنت کو صفحہ ہستی سے معدوم کر دینے کیلئے تلی بیٹھی رہتی تھی لیکن قانونی بندشیں کتنی تھیں ؟ ان سے تخت دلی پر متمکن سلاطین بالکل ناآشنا تھے۔

شریعت اِنکے احکام کی تابع تھی اور بیچارے قاضی جو مسند انصاف پر بیٹھے خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل کرنی چاہتے تھے اکثر قرآن و احادیث کو قہراً و جبراً پس پشت ڈالدینے پر مجبور کر دئے جاتے تھے۔ بادشاہ اوقاف کو ضبط کر لیتے تھے اور پھر لطف یہ کہ یہ احکام ضبطی نہ غیر منصفانہ تھے۔ نہ عدم جواز کا شائبہ لئے ہوئے ہے، دیوانی و فوجداری کا ایک نام نہاد ضابطہ بھی ضرور رہوگا لیکن کیسا جس کا ہر ہر حرف ہر وقت وہ آیت "شاہی فرمان" پر شکست ہو جانے والا۔ بادشاہ کی "مرضی" ملک کا قانون تھا اور ایسا قانون جسکے سامنے قوم توانین نگوں۔

شریعت اور قانون میں جو کشمکش تھی وہ سلطان علاءالدین خلجی اور مشہور و معروف قاضی القضاۃ مغیث الدین (بیانہ) کے مکالمہ تاریخی سے بہتر اس نکتہ پر روشنی نہیں ڈالتی،

قاضی - "اعلیٰ حضرت مجھسے ایک شرعی مسئلہ پر استفسار فرماتے ہیں لہذا میں مجبور ہوں کہ کتب شرعیہ کے مطابق جواب دوں لیکن اگر مجھسے اس مسئلہ پر سیاسی نکتہ نظر سے دریافت فرمایا جائے تو میں عرض کرونگا کہ جو کچھ جہاں پناہ کرتے ہیں وہ کمال منصفانہ اور حکومت کی روایات و قوانین کی مطابقت میں ہے" سلطان .... اپنے نافذ کردہ چند قوانین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سلطان "وہ سپاہی جو قواعد میں حاضر نہیں ہوتے میں ان کی تین سال کی تنخواہ بطور جرمانہ واپس لے لیتا ہوں، امن شکن لوگوں اور باغیوں کو میں مع انکے اہل و عیال حمایت کرنیوالوں اور رفقا کے تلوار کے گھاٹ اُتار دیتا ہوں، اور ان کی تمام جائداد و مال کو ضبط کر کے خزانہ میں داخل کر دیتا ہوں، یہ سزائیں اور وہ سزائیں جو میں شراب خوروں۔ چوروں، قماربازوں اور زانیوں کو دیتا ہوں۔ کیا تمہارے خیال میں یہ سب خلاف شرع اسلام ہیں ؟"

قاضی کانپ اٹھا۔ لیکن اس نے پھر ایکبار زبان کھولنے کی اجازت لی، اور سلطان کے پائے مبارک کا بوسہ دیکر دبی زبان کہہ ہی گیا کہ خلاف شرع اور بیشک خلاف شرع" وقت گیا بات گئی قاضی رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت کہتا ہوا گھر آیا۔

دوسرے دن جب اسکو دوبارہ باریابی کا شرف حاصل ہوا تو سلطان نے ارشاد فرمایا۔

"میں پڑھا لکھا نہیں، نہ فرض جانتا ہوں نہ نفل، لیکن میں تمکو یقین دلاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں اور بخوبی جانتا ہوں کہ جو کچھ تم نے کہا ہے وہ سچ ہے مگر دنیا اور بالخصوص ہندوستان میں محض شریعت کے توسط سے اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا۔ جبتک میں سخت سزائیں نہ دوں، ملک میں امن و امان برقرار نہیں رہ سکتا، مذہبی مواعظ اس زمانہ کی خلقت کو ہرگز راہ راست پر نہیں لا سکتے۔ میں جانتا ہوں کہ شریعت سخت سزاؤں کی اجازت نہیں دیتی لیکن جب دُرّوں، جیلخانہ اور گردن زدنی کا خوف بھی ان امن شکنوں کو باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو آخر کار میں مجبوراً اپنی تدابیر اختیار کرتا ہوں۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے اور میرا خدا ضرور مجکو اپنے دامن عفو میں لے لیگا"

یہ تقاضائے وقت اور اسلام کے تقابل کا سوال تھا اور ہمیں شک نہیں کہ تقاضائے وقت غلبہ پذیر رہا۔ دور وسطے کے اس غیر مسلم۔ غیر ہند و مطمح نظر حکومت کے متعلق دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اولاً یہ فضا کیونکر پیدا ہوئی؟ اسکے متعلق یہ کہنا ہی عبث ہے کہ یہ بیرونی مسموم ہوا تھی۔ اور یقیناً غیر اسلامی، لیکن اسکے ساتھ ہی اسکا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ ہندوستان میں مسلمان فاتحین کے قدموں کے ساتھ ساتھ آئی اور اس نے دور وسطے کی ہندوستانی فضا میں اچھی طرح سرایت کر کے اسکا حلیہ بدلدیا۔ دوم۔ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ کس حد تک جائز تھا؟ اور ہمارے بزرگان نے جو تلواریں مثل چھڑیوں کے باندھے پھرا کرتے تھے کیونکر ایسی خونریز سلطنت کے زیر سایہ پڑے رہنا گوارا کیا حالانکہ وہ بخوبی محسوس کرتے تھے کہ سلطنت کا رویہ نہ قدیم روایات کے مطابقت میں تھا نہ انکے مذہب کے رو سے،

پہلے سوال کا جواب دوسرے سوال سے بہت آسان ہے جب خلفائے بنی امیہ نے اپنے دار الخلافۃ کو مدینہ سے دمشق منتقل کیا ہے تو ان پر رفتہ رفتہ رومی اثرات نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا پھر جب خلفائے بنی عباس نے دمشق سے دار الخلافۃ کو منتقل کر کے بغداد کو عزت دی، تو ایرانی اثرات نے رومی اثرات کی جگہ لی، اسکے بعد جب چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ایران میں قائم ہونا شروع ہوئی ہیں تو ایرانی تہذیب و تمدن نے اسلام پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا، دور جمشید کا جام بہا تا اب ایک نئے قدح کے شان میں تھا۔ اب نہ وہ زمین تھی نہ وہ آسمان جمہوریت

پسند آزاد اور اکھڑ۔ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے والے عرب عیش و آرام کی آغوش کے پروردہ نفاست کے دلدادہ عجموں کے سامنے وحشی تھے، مسلمانوں نے ایک قہار سلطنت کی قبائے حکومت کی دھجیاں اڑا دی تھیں، لیکن اسکا نتیجہ کیا ظاہر ہوا؟ مسلمان فاتحین کی آنے والی نسلوں پر کبھی نہ فنا ہونے والی ایرانی تہذیب و تمدن کا جادو چل گیا۔ دوسری طرف ہماری نئی اسلامی دنیا میں جسکے دامن عاطفت میں اب ایران بھی تھا۔ دوبارہ ایک انقلاب اور مکمل انقلاب ہو گیا، ایران اب بالکل صنم پرست تھا اور سب سے زیادہ صرف ایک شخص کی قوت تخیلہ کی بدولت ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ جتنا محمود غزنوی نے بت پرستی کی بنیاد کے استیصال کیلئے کیا تھا اس سے زیادہ اور کہیں زیادہ فردوسی کے شاہنامہ نے اسکے استحکام میں کر دکھایا۔ ہزارہا بت سرنگوں کر دیئے گئے لیکن بت پرستی ایک بنی ہوئی آگ کی طرح ابھرتی ہی رہی، اور ہندوؤں کے فرسودہ بھدے بتوں کی جگہ آخرکار معجزنما ہاتھوں کے اصنام نے لے ہی لی، مسلم مجاہدین میں جنھوں نے سومنات کو توڑا وہ خلیفہ ثانی کی مثال یا اسلام کے احکام سے وہ ولولہ نہیں پیدا...... ہوا جو قدیم ایران کے فرضی سورماؤں کے کارناموں نے ایسی صدہا داستانیں زبان زد خلائق اور ایران کے گاؤں گاؤں میں مشہور تھیں، فردوسی نے تو بہت زمانہ بعد ان کو اپنے بے مثل شاہنامہ میں حیات جاوید بخشی،

ہم جس طرف بھی نظر دوڑاتے ہیں وہی سماں پیش ہے۔ ہمارے دور وسطے کے مورخین اپنی تصانیف کو نہایت عقیدت سے پہلے حمد و ثنائے باری سے شروع کرتے ہیں پھر نعت رسول اور منقبت خلفائے راشدین ہوتی ہے، لیکن دنیا کے معاملات میں کوئی بھی مورخ رسول مقبول کی طرف رجوع نہیں کرتا، کیا اس نکتہ کے بھی حل کی ضرورت ہے؟ جواب ظاہر ہے وہ فوراً کہدینگے کہ فریدوں کیا کاؤس۔ کیخسرو نے ایسے حالات میں ایسا کیا۔ کیا کوئی تاریخ بتلا سکتی ہے کہ فیروز۔ تغلق نے کوئی ایسا قانون نافذ کیا جسمیں عفت دار عورتوں کو پردے کی پابندی کرنے کے لیے مجبور کیا گیا ہو، مورخ اس موقع پر جمشید کی نصیحت کو پیش کریگا کہ عورت کے لیے بہترین مقام اسکا گھر ہے یا پھر۔ چہ خوش گفت جمشید بہ رائے زن کہ یا خانہ یا گور بہ جائے زن

اس امر پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا کہ محمود غزنین۔ شمس الدین غوری یا شہاب الدین التمش میں اسلامی جذبہ نہیں تھا، اسلام اسکا کوئی جواب نہیں دے سکتا، نہ وہ انکے افعال کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ان تاجداروں کا

راسخ عقیدہ تھا کہ وہ اپنے مذہب کے اصول پر ثابت قدم ہیں۔ اور یہ کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ درحقیقت اسلام کی خدمت ہے، اس مقام پر ایک نکتہ اور قابل غور ہے وہ یہ کہ قدیم ایرانی سلطنت کا طغرائے امتیاز ایک یہ بھی ہے کہ وہ ایک خدائی شان رکھتی تھی، بخلاف اسکے خلیفہ المسلمین کافتہ المسلمین کا منتخب کردہ ہوتا تھا اور اسکی قوت کا مبدا گویا کہ جمہور مسلمین تھے۔ لیکن شہنشاہان ساسانیہ ایران اپنی الوہیت کے بھی دعویدار تھے جو خاندان سریر آرا تھا وہ مقدس ترین بھی خیال کیا جاتا تھا اس خاندان قدسیہ کے سوا کوئی دعویدار تخت و تاج نہ ہو سکتا تھا بادشاہوں کی عبادت ہوتی تھی۔ اور اس طرح پوجے جاتے تھے جیسے خدا، اس بحث کے بعد بھی بادشاہت، ایک پہیلی ہی رہی' سوال یہ ہے کہ دنیا ایک ایسے شخص کو جو نہ طاقت میں نہ عقل و دانش میں اپنے دوسرے ابنائے جنس پر برتری رکھتا تھا کیوں قابل پرستش سمجھتی تھی؟ قدیم ایرانی مورخین اسکا ایک مختصر جواب یہ دیدینگے کہ وہ خدا تھا، کیا خوب، یہ مسئلہ اصل یہ ہے کہ کسی طرح حل ہونا تھا نہوا، لیکن عوام کی تشفی کے لیے یہ نایاب جواب، تو کافی ہو گیا۔ شہنشاہان ساسانیہ کی الوہیت کے معنی دوسرے الفاظ میں درحقیقت تمام ایران کے اجزاء منتشر کی شیرازہ بندی اور انکا تمام مفتوح اقوام پر تسلط کامل ہے۔

ایرانی تہذیب و تمدن کے احیاء کے ساتھ الوہیت بادشاہ کا نظریہ قدیم پھر زندہ ہو گیا۔ لیکن نمایاں ترمیم کیساتھ، کیوں؟ اسلیے کہ اسلام کسی صورت سے بت پرستی اور کفر و الحاد کو روا نہیں رکھ سکتا تھا اس نے اسی نظریہ اور عام عقیدہ پر ایک ہلکی سی نقاب ڈالدی، یعنی مسلمانوں کا بادشاہ الوہیت کا دعویدار تو نہ تھا لیکن وہ ظل اللہ ضرور مانا جاتا تھا، اسکی ذات معصوم نہ تھی نہ وہ خود غیر فانی تھا لیکن خلافت اپنی جگہ پر مبرا تھی۔

اس طرح سے ہمارے دور وسطی کے بادشاہ بجائے خود ایک عجیب انسٹی ٹیوشن تھے۔ بادشاہ کی تمام طاقت کا مبدا ایرانی روایات یقین کرتا تو سلاطین اسلام اپنے ذاتی فرائض اور فرائض سلطنت میں ایک نمایاں خط تفریق کھینچے ہوئے تھے۔ جہانتک کہ قانون ملک کا تعلق تھا اسمیں شرع کو دخل کہاں ؟، انکا طرز عمل اور پالیسی تبلا رہی ہے کہ وہ اپنے تئیں صرف مسلمانوں ہی کا سلطان متصور نہیں کرتے تھے بلکہ خود کو اپنے تمام رعایا مسلم و غیر مسلم سب کا تاجدار خیال کرتے تھے۔ یہ نکتہ اس موقع پر بہت ہی قابل غور ہے، کیونکہ اس دور وسطی میں ایک عجیب و غریب قومی جذبہ کا ثبوت ملتا ہے ایک طرف تو سیاسیات اور مذہب کی ایک دوسرے سے مغائرت دوسرے طرف تمام سلطنت دہلی کی تمام رعایا کو خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ایک نظر سے دیکھنے اور سبکو مساوی حقوق دینے کا میلان ظاہر ہوتا ہے۔

(باقی دارد)

عالمِ رؤیا

بقلم ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا، بی۔ اے، پی، ایچ۔ ڈی، ڈی۔ او۔ ایل

اگر آدمی کی مدتِ حیات کو حساب کریں تو قریباً نصف حصہ اس مدت کا خواب میں گذرتا ہے، اس نصف زندگی میں انسان جس عالم میں رہتا ہے اسکو عالمِ رویا کہتے ہیں، عالمِ رویا کی حقیقت پر بہت کچھ غور کیا گیا مگر خاک بھی سمجھ میں نہ آیا ہم بھی اسکا دعوی نہیں کر سکتے ہیں کہ ہم کچھ سمجھ سکتے ہیں مگر اسی پر کیا موقوف ہے، ہم کو کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہوئی

"معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"

مگر اہلِ فلسفہ کا یہ قول ہمارے مفید مطلب ہے کہ کسی علم میں موضوع کی حقیقت سے بحث نہیں کی جاتی صرف موضوع کے عوارض سے بحث کیجاتی ہے۔ پس عالمِ رویا کی حقیقت کو ترک کر کے صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ امورِ محسوسہ خواب کے کیا ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ حس بھی وہاں معطل ہے، بلکہ حسیات کی تعطیل ہی کا نام خواب ہے۔ مگر خدا کی قدرت ہے کہ جب خواب میں یہ حواس ظاہری اور باطنی معطل ہوتے ہیں تو ان کے عوض ہم کو عالمِ رویا کے حواس ملجاتے ہیں آنکھ بند ہوتی ہے مگر ہم دیکھتے ہیں، کان کھلے نہیں ہوتے مگر سنتے ہیں، اسیطرح جملہ حواس مثل ان حواس ظاہری کے عطا ہوتے ہیں، بلکہ حواس باطنی بھی، یعنی حس مشترک خیال وہم فکر ذکر اگر قوت حافظہ کام نہ کرتی تو خواب کی باتیں یاد کیوں رہتیں۔ بلکہ اعضا بھی مثلاً ہاتھ پاؤں سب اپنا اپنا کام کرتے ہیں، ہم ہاتھوں سے وہاں کی چیزوں کو اٹھا سکتے ہیں، پاؤں سے کوسوں دوڑتے چلے جاتے ہیں رفتار بہت سریع ہوتی ہے بلکہ اس عالم میں ہم کو قوت پرواز بھی کبھی ملجاتی ہے، عالمِ اسباب کی چیزوں سے کیا ہے جو وہاں موجود نہیں ہمنے خود گھوڑے کی سواری کی ہے، مکان مع اثاث البیت خواہ بجز اپنے خواہ ذاتی میز، کرسی، پلنگ، قلم، دوات، شب کے وقت شمع، فانوس، لمپ، مکان اور سامان ضروری کے ساتھ وہ عالم غیر آباد نہیں ہے عزیز، اقربا، دوست، آشنا سب وہاں موجود ہیں، ہم اور لوگوں کے مکانوں میں بھی جاتے ہیں، جو لوگ وہاں ملتے ہیں،

ظاہر ہے کہ ہم انسے واقف نہیں ہیں (ا) اسباب ظاہر ا مگر اجنبی بھی نہیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یا ہمارے کسی عزیز قریب کا مکان ہے جو لوگ وہاں موجود ہیں اُن سے قرابت ہے کبھی ماں باپ بھائی بہن چچا، بھتیجے ماموں بھانجے غرضکہ سارا کنبہ وہیں موجود ہے۔ اسکے علاوہ بڑے بڑے شہر دریا، پہاڑ، ندی نالہ، باغ، جنگل، جانوران اہلی و صحرائی۔

ان سب چیزوں کا پڑھے لکھے لوگوں نے ہم کو ایک نام بتادیا "خیال" یہ لفظ ایسا وسیع ہے کہ اسکے مفہوم میں وہ تمام عالم جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں شامل ہے یہ لفظ ہم کو حقیقت سے دور کر دیتا ہے جس سے کچھ پوچھئے وہ یہی کہہ کے ٹال دیگا خواب و خیال ہے یعنی محض بے حقیقت واضح ہو کہ یہ صرف ایک لفظ ہے جس کو ماہیت کے چھپانے کے واسطے ایجاد کیا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ جس طرح یہاں ہر چیز کو غور سے دیکھ کے اسکے حالات قلم بند کیئے جاتے ہیں تنویع و تقسیم کیجاتی، تو متفسر کو ناموں سے تسکین نہیں ہوتی

ہم نے کسی قدر ان امور پر غور کیا ہے کچھ لکھا بھی تھا مگر ابھی ناتمام ہے ع

"کار دنیا کسے تمام نہ کرد"

دیکھنا یہ تھا کہ یہ حواس اور آلات بدن بلکہ تمام جسم مثل اسی جسم کے جو عالم بیداری میں کام کرتا ہے یا وہ عالم جسکو عالم خواب کہتے ہیں جسمیں ہم چلتے پھرتے دیکھتے سنتے ہیں آیا مادی ہے، یا غیر مادی؟ کبھی یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اسکی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے یعنی مادی نہیں ہے مگر جو کچھ ہم حواس ویائی سے محسوس کرتے ہیں اسمیں ابعاد ثلثہ موجود ہیں طول عرض عمق سب کچھ ہے جب ابعاد موجود ہیں تو مکان اور چیز بھی موجود ہے، جب چلنا پھرنا ہے تو حرکت بھی ہے اور حرکت کے ساتھ ہی زمان بھی ہے، زمین آسمان ثوابت و سیارے غرضکہ پورا عالم مثل اسی عالم کے ہے، مگر یہ عالم وہ عالم نہیں ہے، دوسرا عالم ہے جسکو عالم مثال کہتے ہیں، حکمائے اشراق نے اس "بعد" کو جسمیں وہ عالم ہے "بعد مفطور" کہا ہے۔ زبان شرع میں اس کا نام "عالم برزخ" ہے۔ شرعی حکمت میں مذکور ہے کہ بعد مرنے کے ہم قیامت تک اسی عالم میں رہینگے جس کو برزخ یا عالم مثال کہتے ہیں۔

شہاب الدین مقتول شیخ اشراق ارشاد کرتے ہیں کہ عالم مثال دو ہیں ایک عنصری دوسرا فلکی

دونوں میں بڑے بڑے شہر اور قصبے اور قریے اور رہنے والے وہاں کے انھیں شہروں میں آباد ہیں "جابلقا" اور "جابرصا" عنصری عالم کے شہر ہیں ہرقلیا فلکی شہر ہے اہل ہنود بھی اس عالم کے قائل ہیں اہل ہنود کی کتابوں میں اس عالم کے ایک شہر کا پتا ملتا ہے جسکو شہر بعت باز کہتے ہیں

شہر اجین میں ایک امیرزادہ بہت شوقین مزاج عیش پسند تھا ہمیشہ عیش و نشاط میں مصروف اکثر اوقات ناے و نوش کی صحبت رہتی تھی ایک دن اپنے دیوان خانہ میں بیٹھا ہوا تھا یاران طریقت کا مجمع تھا بقول شاعر

فرصت اگر م دست دہد مغتنم شمار ساقی و مغنی و شرابی و سرودے

اس اثنا میں ایک شخص وارد حال ہوا مگر بہت پریشان حال منہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئی۔ چشم نم دل پرغم، ایک گوشۂ بساط پر آکے بیٹھ گیا، کہاں تو سب لوگ شراب و کباب کے شغل میں تھے گانے بجانے کا چرچا تھا اس شخص کے وارد ہونے سے سب برداشتہ خاطر ہو گئے سب کا عیش منغص ہو گیا

"آزردہ دل آزردہ کند انجمنے را"

سب اس کو اس حال پریشان میں دیکھ کے متفسر احوال ہوئے وہ جوان عالم سکوت و محویت میں تھا بات کرنا ناگوار تھا ان لوگوں کے سوال کا جواب دیتا تھا آخر لوگوں نے سخت اصرار کیا اس نے انکار کیا اور کہا تو یہ کہا کہ میرے احوال کے سننے سے خوف ہے کہ آپ بھی اسی حال میں مبتلا ہو جائیں جیسیں میں ہوں اور میں اس کا باعث ہوں مگر جب اصرار حد سے گذرا اس جوان نے کہا کہ آپ لوگ میرا کہنا نہیں سنتے تو تو پھر سنیے :-

میں تجارت پیشہ ہوں ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں قافلہ سے نکل کے جنگل کی سیر کرتا ہوا، کچھ دور نکل گیا مختصر یہ کہ اپنے قافلے سے چھٹ گیا۔ تنہا رہ گیا بہت کوشش کی کہ قافلہ تک پہنچوں نہ پہونچ سکا ایک دشت میں مارا مارا پھرتا تھا آخر شام قریب آگئی میں بہت گھبرایا مگر تھوڑی دور اور چلا اب کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دریاے ذخار کے کنارے پر ہوں رات بھی ہو گئی تھی ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا نہ پاے رفتن نہ جاے ماندن فکر میں تھا کہ اب کیا کروں، اس دریاے موّاج کا دوسری طرف کا پاٹ نظر نہیں آتا نہ کشتی نہ ملاح اسی تردد

میں تھا کہ دور سے ایک شخص کو آتے دیکھا خوش ہوا کہ اس سے کچھ چارۂ کار ہوگا۔ اُس نے آتے ہی مجھ کو ڈانٹنا شروع کیا کہ تو اس صحرا و دریا میں کیا تلاش کرتا ہے معلوم ہوتا ہے غول بیابانی ہے بندگان خدا کے گمراہ کرنے اور آزار پہونچانے کو یہاں بیٹھا ہے۔ اس ڈانٹ ڈپٹ سے میری گھگھی بندھ گئی، آخر دل کو تھام کے بمشکل اس سے راہ سخن پیدا کی ہاتھ جوڑ کے کہا "اے شخص! نہ میں دیو ہوں نہ غول، مصیبت زدہ، گم کردہ راہ ہوں، برائے خدا رحم کر اور مجھ کو بستی کا نشان بتا دے، راہ پر لگا دے،

آخر اس شخص کو رحم آیا مجھ سے کہا کہ زیادہ نہ گھبرا۔ اب تو منزل مقصود پر پہونچ گیا ہے، یہاں سے قریب ایک شہر ہے جسکو "لعبت باز" کہتے ہیں چل، میرے ساتھ چل، میں شہر تک پہونچا دوں گا"
میں اسکے ساتھ ہولیا۔ راہ میں باتیں ہوتی جاتی تھیں وہ اس شہر کی صفت بیان کرتا تھا

آخر ہوتے ہوتے شہر پناہ نظر آیا عالیشان پھاٹک لگا تھا شہر میں داخل ہوا، وہ شخص دربان تھا، پھاٹک پر رہ گیا مجھ سے کہا کہ جا شہر کی سیر کر، پھر کاروان سرا میں جا رہنے کو مکان ملے گا، کھانے پینے کا بھی سامان ہو جائے گا"

سامعین اسکے بیان کو گوش دل سے سن رہے تھے، قضا را ایک بڑی سی بلی کوٹھے پر سے کود کے اسی محفل میں گری۔ سب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، ہلڑ ہو گیا، ایک لمحہ کے بعد خاطر جمع ہوئی، اب جو دیکھا تو اس شخص کا کہیں نشان نہ پایا۔ قریب کی گلیوں میں تلاش بھی کیا۔ بلکہ ذرا دور بھی نکل گئے، نہیں معلوم اس شخص کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا،

آخر وہ سب پھر پھرا کے آ گئے۔ مگر محفل کا وہ رنگ جو پہلے تھا پھر نہ جما۔ صاحب خانہ کو کمال اشتیاق اس شہر کے دیکھنے کا ہوا، یہ بھی اس شخص سے سن لیا تھا کہ یہ واقعہ قنوج کے قریب دس بیس کوس کے فاصلہ پر ہوا تھا

(باقی آیندہ)

نظیری کا تخیل
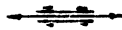
بقلم جناب آغا اشہر صاحب لکھنوی مؤلف "حضرت رشید"

خانخاناں کا زمانہ ہے۔ آذربائجان سے فارسی کا ایک نوجوان شاعر ہزارہا اچھوتے مضامین کا خزانہ اپنے دل میں لئے ہوئے ہندستان کا عازم ہے۔ غالباً پہلے اسکا مطمح نظر تو یہی ہوگا کہ جسقدر اُسکے کلام پر اہل ہند زروجواہر نثار کرینگے اُسی قدر اُسکے حوصلوں کا دامن وسیع ہوتا چلا جائیگا۔

سرزمین ایران کی فضا جسقدر تخیل شاعرانہ کے لئے قدرت نے موزوں بنائی ہے اس کا اندازہ انھیں حضرات کو ہو سکتا ہے جو شاداب و زرخیز خطوں کے باشندے ہیں۔ ایران کی بہار اور اُسکی ہواؤں کی خنکی شاعرانہ دماغوں کے لئے کیف شراب ہے کم نہیں۔ اُس خطہ گلریز کے چمن زاد پھولوں کی مہک نے اطراف عالم کی فضاؤں کو ایسا لبریز کر دیا ہے کہ آجتک اُسکا احساس شاعری کی دنیا میں باقی ہے۔

نظیری کی ہندستان کیطرف حرکت کئی صورتوں سے اسکے کلام پر روشنی ڈالتی ہے۔ اول تو یہ کہ ہندستان کے اہل دولت شعرا کی مدح گوئی کو اپنے لئے بقائے نام کا ذریعہ سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اُن کی دولت کا معتدبہ حصہ قدردانی شعرا میں صرف ہوتا تھا۔

شاعری کو فارغ البالی سے بہت کچھ تعلق ہے، نظیری نے صحیح خیال کیا کہ اگر اُسکی زندگی امرائے ہندستان کی قدردانی سے حصول معیشت کے ناگوار اثرات سے محفوظ ہو گئی تو پھر کوئی وجہ اُسکی ترقی میں سنگ راہ نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ اُسوقت کے امرا میں خانخاناں بہادر کو شعر سے زیادہ ذوق تھا، اسوجہ سے یہی دربار اُس نے اپنی ہنوی کے لئے منتخب کیا۔

ثانیا یہ کہ تاجداران ہند فارسی نژاد تھے اور فارسی خیالات اور فارسی زبان سے انھیں قدرتی تعلق تھا، اور کیوں نہوتا۔ اُن کے بیشتر افراد اسی فضا کی آغوش کے پرورش یافتہ تھے اگر کوئی تاجدار ہندستان میں پیدا بھی ہوا تو اُس نے آنکھ کھول کے اپنے گھرانے کے چاروں طرف اسی خطہ سلاطین خیز کے افراد کو دیکھا

ہندوستان میں عالم شعر کا یہ حال تھا کہ شعرا کلام فارسی ہی سے ذوق رکھتے تھے اور اسی زبان میں سخن آرائی کرتے تھے لیکن جب کسی ایرانی شاعر کی ذات درمیان میں آجاتی تھی تو عوام اسی کی طرف متوجہ ہوجاتے تھے۔

بہرحال نظیری کو بھی اپنے معاصرین میں امتیازی صورت حاصل ہوگئی اور خانخانان کی عزت افزائی نے اُس کے کلام میں چار چاند لگا دیے۔ فارغ البالی نے اُس کو شاہراہ بلندی خیالات پر ڈال دیا فضلائے ہند نے اس کے نہال شاعری کو اسقدر ترقی پہنچائی کہ خوشہ چینوں نے اپنے اپنے دامن بھر لئے۔ مذاق اسقدر جدت طراز پایا تھا کہ تخیل قدیم کا پابند ہوتے ہوئے اس نے دنیائے شعر میں اپنے جدید رنگ کا سکہ رائج کردیا۔ شعر میں نہ تو وہ حافظ کا پیرو ہے۔ نہ خاقانی کا۔ نہ فردوسی کا۔ اُس کا تخیل ان سب کے تخیل سے ہٹا ہوا ہے۔ غزل کہتا ہے مگر اسمیں کسی دوسری صنف کے مضمون کو نہیں کھپاتا۔ قصیدہ کہتا ہے مگر اُس کو تغزل آمیز مضامین سے مملو نہیں کرتا۔ تصوف کی طرف جاتا ہے مگر اُس کی حدوں میں رہتا ہے۔ مدح کرتا ہے تو اس کا شعر آسمان سے باتیں کرتا ہے۔

نظیری کا عرفان

او بہ خراشش چو سیل ما ہمہ ویران او
آنچہ ز ما شد خراب رفتہ بجولان او

عالم مادیات کا قیام اس ایک قوت سے ہے جو خلاق عالم کے نام سے یاد کی جاتی ہے وہی قوت عناصر کو صورت ترتیب عطا کرتی ہے۔ نشو ونما دیتی ہے۔ اور ایک زمانے کے بعد پھر اُن کو پراگندہ کرکے معدوم کردیتی ہے

نظیری کی غرض یہ ہے کہ قدرت ذات احدی کا سب سے بڑا ذریعہ تخریب مادیات ہے۔ دنیا کے تمام اشیاء راہ فنا میں معدوم ہوتے جاتے ہیں مگر وہ ذات اپنی قدرت کے انکشافات اور وسیع کرتی چلی جاتی ہے۔

اے جلالت خلوت از اغیار تنہا ساختہ   حکمت تو از کرم دی کار فردا ساختہ

ظاہر ہے کہ وجود خداوندی کے متعلق آج تک کسی نے تعیین وقت نہیں کی۔ اور اس کو سوائے منفرد ہونے کے کسی غیر ذات کی شرکت سے ملوث نہیں کیا۔ فلسفہ بھی جس حیثیت سے قائل ذات خداوندی ہے۔ وہ بھی بحیثیت اختیارات مذہبی خدا سے الگ نہیں۔ وہ ایک قوت ہی سہی جو علت العلل ہے۔ مگر دوسری

قوتیں جتنے نظام عالم کو کام پڑتا ہے اُس کی ماتحت ہیں۔

دوسرے شعر میں نے اس خیال کی اور تصریح کر دی یعنی دوسری جتنی قوتیں ہیں ان کو عمل کا موقعہ تو ملتا ہے جب اُس کے اسباب فراہم ہو چکے ہوں۔ مگر اس وقت ممتاز نے بغیر اسباب نظام عالم کا ایک خاکہ تیار کر دیا' جو شروع ہو کے ہمیشہ جاری رہنے والا ہے۔

حدیث حسن و مشتاقی دروں پردہ نہاں بوُد — برآمد شوق از خلوت نہاد ایں راز بر صحرا

تخلیق عالم کا سبب اول ظہور قدرت خالق کے سوا اور کچھ نہ تھا حسن ازل کی تجلی نے نقوش ماسوا پیدا کر دئے۔ اور یہی خالق و مخلوق کا تعلق روح تخلیق ہے۔ عالم کے کسی ایک ذرے کا اپنے مرکز سے تعلق چھوڑ دینا عدم کہلاتا ہے۔

ظہور قدرت ایک ہی صورت تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ اس کا اظہار مختلف صورتوں سے ہوا۔ جمادات نباتات حیوانات۔ سے کرہ عالم معمور ہے۔ شاعر نے "صحرا" کی لفظ ایسی وسیع المعنی صرف کر دی ہے کہ جواب نہیں۔ دونوں پہلوؤں سے لطافت معنی بڑھی جاتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مخلوقات سے پہلے عدم ہی عدم تھا۔ تخلیق اشیاء کر کے قدرت نے اپنے بے حساب رازوں کا انکشاف کر دیا۔ یا یہ کہیں کہ ظہور قدرت ویرانۂ عالم کی آبادی کا باعث ہو گیا' دونوں نکتے لاجواب ہیں۔

ز خط و خال رخسارش قضا شکلے نمو اوّل — قلم برداشت ہر ذرہ ورق برگشت از انشا

اس کرۂ خاک کی ہر شئے ذرات یا اجزا سے مرکب ہے۔ خدا نے اپنی قدرت بالغہ سے تشکیل ذرات با حسن وجوہ کی اور اس کے بعد دوسرے اشیاء مادیات کی ترتیب ظہور میں آئی۔

شاعر چاہتا ہے کہ مخلوق سے تعریف خالق کرائے۔ اور حمد تعریف یہ ہے کہ وہ پہلے اسباب ذرات جنسے عالم مادیات وجود میں آیا انھیں کی زبان سے حمد و ثنا شروع کرے۔

نظیری مسلمات حقیقت کے دائرے سے آگے قدم نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کی ذکاوت انھیں فرسودہ راستوں سے نئی شاہیں اظہار حقیقت کی پیدا کر لیتی ہے جو نگاہوں کو لطیف در لطیف معلوم ہوتی ہیں۔

بر حمت اتصال افتد چو بوسے بر زند از ہم — بفر صنعت ظہور دریا شود چوں قطرہ شد دریا

یہ امر مسلمات سے ہے کہ ہر شئی اپنے حیّز کی طرف مائل ہوتی ہے - خاک خاک میں - پانی پانی میں - اور ہوا ہوا میں ملجاتی ہے - اسی طرح وجود انسانی کا جتنا حصّہ عناصر سے تعلق رکھتا ہے ایک وقت انھیں میں پھر جذب ہوجاتا ہے - مگر وہ نورانی شئی (روح انسانی) جس کا منبع نور حقیقت ہے اپنے مرکز کیطرف عود کرتی ہے - مگر بہزار دقت - اُن دقتوں کی تشریح یوں ہوسکتی ہے - کہ انسان جس مُدّت تک زندہ رہتا ہے اس کی روح عالم تجرید سے ناآشنا ہوتی چلی جاتی ہے اور جسوقت انفصال جسم و روح ہوجاتا ہے - تو آخر الذکر اپنے مرکز پر پہنچ کر وہاں کے مناظر سے کچھ روز بیگانہ رہتی ہے - اُسی دریائے نور سے یہ تمام قطرات ارواح عالم نکلے ہیں اور ایک دن پھر اُسی میں ملجائیں گے - شاعر 'ہمہ از دست' اور 'ہمہ اوست' دونوں کا اجتماع کرتا ہے جہاں تک غیر نور سے تعلق تھا اُس کی ایک بُعد احدؔ متعین کردی - اور جہاں روحانی تعلقات کا اظہار کرتا ہے وہاں ترکیب عناصر سے ہٹ کے خود ذات خلاق عالم تک روح کا سلسلہ پہنچاتا ہے - یہ مسائل بہت مبسوط بتشریح چاہتے ہیں اور ادبی قلم کی حدود سے باہر ہیں لہذا میرا قلم جا بجا اختصار سے کام لے رہا ہے تاکہ صرف اظہار مطلب ہوجائے -

اے از کرم نریختہ خونِ سمٰعیل را   وز لطف عید کردہ عزائے خلیل را

شاعر خدا کے کرم عمیم کو دکھاتا ہے اور تاریخ اسلام کی سرگذشت Mythology سے بحث کرتا ہے کیونکہ تاریخ اسلام میں واقعۂ 'ابراہیم' و 'اسمٰعیل' سے بہتر کوئی ثبوت اظہار کرم خداوندی کا نہیں ملتا - اگرچہ قربانی منظور بارگاہ ایزدی ہوچکی تھی اور خون اسمٰعیل مباح ہوچکا تھا مگر چونکہ حضرت ابراہیم میزان امتحان میں پورے اُترے - لہذا اُسکے صلے میں خدائے برتر کی طرف سے اظہار کرم کیا گیا - اسمٰعیل ذبح ہوجاتے تو مہربان باپ کے لئے باعث رنج ہوتا مگر کرم خداوندی نے اُس رنج کو مبدل بطرب کردیا -

مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات آفات دنیوی میں ایسا مبتلا ہوجاتا ہے کہ سوائے اسکے چارہ نہیں کہ وہ تقدیر پر شاکر ہوکے طوعاً و کرہاً مصائب کو برداشت کرنے کا بالجزم ارادہ کرلے لیکن باوجود اسکے بعض اوقات پردۂ غیب سے ایسے اسباب پیدا ہوجاتے ہیں کہ تمام مشکلات ایک لمحے میں برطرف ہوجاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی مصیبت آنے والی ہی نہ تھی - یہ کیا ہے؟ یہ اُسی ذات بے نیاز کا کرم ہے - اس ضمن

میں ذیل کا شعر بھی باوجود اختلاف مضمون دلچسپی سے خالی نہیں۔

تو اگر ز کعبہ رانڈی چہ گراز کنشت مارا　　غم بندہ پرور تو بدرے بہشت مارا

ایرانی شعرا سے لیکے اردو کے دور آخر تک کے شعرا اس امر کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ ان کے دوسرے اصناف سخن سے حمد و ثنا زیادہ چست و بلند رہے۔ مگر ع۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ عرفی کا آسماں پیما خیال اس معاملے میں نظیری کے تخیل کا ہمسایہ ہے۔ خاقانی بیشک بہت جید الفکر ہے مگر اس کا تخیل لطیف نہیں۔ عرفی و نظیری کے یہاں رفعت خیال کے ساتھ ساتھ لطف خیال بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں شاعروں کا کلام مابعد کے لئے مثال قرار پایا۔ ذیل کے موازنہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرفی و نظیری دونوں کا خیال دریائے معرفت میں غوطہ لگاتا ہے اور دونوں ایک ہی وزن کے موتی نکالتے ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ ایک کی قدرتی ساخت دوسرے سے بالکل علحدہ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

عرفی

من کہ باشم عقل کل را تا و کل انداز ادب
مرغ اوصاف تو از اوج بیاں انداختہ

نظیری

عقل را بیں کاندریں صحرائے پر خوف و خطر
صید گنجشکے نکردہ دام عنقا ساختہ

دونوں معرفت ذات خداوندی میں اظہار کرتے ہیں اور دونوں کا عنوان بیان ایک ہی راستے پر جا رہا ہے۔ گو عرفی کا تخیل بظاہر بہت بلند معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس نے کوشش عرفان ایزدی میں تحیر کو دخل دیا ہے۔ لیکن نظیری عقل کی کوشش پر نظر استہزا کرتے ہوئے معرفت ذات خداوندی کو غیر ممکن ثابت کرتا ہے۔

رباعیات تعشق لکھنوی

نام:- سید میرزا صاحب المعروف بہ سید صاحب مغفور۔ سنہ ولادت نامعلوم [1] سنہ وفات ۱۳۰۹ھ [2]

"تعشق کا کلام اربابِ ذوق کی نظروں سے پوشیدہ ہے، مراثی اور رباعیات کا ایک مجموعہ نواب سید محمد تقی علی خاں صاحب سکندر لکھنوی کے پاس محفوظ ہے، ممکن ہے کہ غزلیات بھی ہوں، جناب سکندر کو جو انس تعشق سے ہے اس کا ثبوت اس امر سے ہو سکتا ہے کہ موصوف سال میں دو مجلسیں نہایت عقیدت سے کرتے ہیں، باذاق اصحاب جس شوق سے لکھنو کے اکناف و جوانب سے اپنے محبوب شاعر و مرثیہ گو کا مرثیہ سننے آتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہنوز لکھنو کا مذاق سخن تعشق کی شاعری کا دلدادہ ہے، بہر کیف یہ رباعیات ہم کو جناب سکندر صاحب سے حاصل ہوئی ہیں جس کے لئے ہم موصوف کے حضور میں شکریہ کے ساتھ گذارش ہیں۔ ممکن ہے کہ ہم آئندہ اشاعت میں کسی مرثیہ کا انتخاب پیش کر سکیں"

عرفانِ حج

ملجائیگا محبوب یہ جس پر دے میں
کس سے پوچھوں کہ وہ کس پردے میں
مرتے ہیں کعبہ کی جستجو میں عاشق
امید وصال کی ہے اس پردے میں

---

[1] باوجود سخت کاوش کے سنہ ولادت معلوم نہ ہو سکا۔ "خمخانہ جاوید" خاموش ہے۔ آغا اشہر صاحب لکھنوی اپنی تالیف "حضرت رشید"، صفحہ ۲۹ میں "تعشق کا ضمناً تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-
"سید صاحب نے ستر سال کی عمر پائی ہے۔ رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ میں انتقال ہوا"

[2] ۱۳۰۹ - ۷۰ = ۱۲۳۹ - غالباً تعشق ۱۲۳۹ھ یا ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔
اس سلسلہ میں موصوف نے علی میاں کامل مرحوم کی وہ تاریخ لکھی ہے جو انھوں نے تعشق کی وفات پر کہی تھی:-

از زبان ہاتف غیبی بتاریخ گوئیش
رفتہ سوئے خلد جان پیمبر آں جناب
۱۳۰۹ھ

درسِ عبرت

یہ راہ ہے کیوں یہاں ٹھہرتا ہوں میں — ساماں رہنے کا جمع کرتا ہوں میں

غفلت غفلت میں جان جاتی ہے غرض — دو روز کی زندگی پہ مرتا ہوں میں

ٹھہرے نہ ذرا عدم کے جانے والے — بڑھ بڑھ گئے الفت کے بڑھانے والے

پاس اپنے جگہ تھوڑی سی ٹھہراؤ کہیں — ہم بھی تو ہیں عنقریب آنے والے

کہتی ہے لحد کہ کیا ہے تیرا گھر میں — ہر وقت ہے خیال میرا گھر میں

او تیرہ دروں! عبث ہے ظاہر کا فروغ — باہر ہے روشنی، اندھیرا گھر میں

اپنی ہستی پہ اشکِ حسرت

کچھ خواب سے بیدار جو ہوتا ہوں میں — اشکِ خجالت سے منہ کو دھوتا ہوں میں

مانندِ گلِ زخم ہوں اس گلشن میں — اپنی ہستی پہ آپ روتا ہوں میں

یا ارحم الراحمین پر ناز

دریائے گنہ سے کوئی ڈرتا ہوں میں — تیری رحمت پہ ناز کرتا ہوں میں

آتا ہے مرے ہاتھ میں دامانِ کرم — جب ڈوب کے طوفاں سے ابھرتا ہوں میں

[illegible]

تھا سر میں غرور، سر جھکانا کیسا؟ — بیہوش رہا، ہوش میں آنا کیسا؟

میں کیا ہوں بھلا، میری عبادت کیا ہے — بس بخش بھی دیجئے بہانہ کیسا؟

جنگ کے اقتصادی اثرات ہندوستان پر

(بعنوان)

بابو اقبال بہادر، ایم، اے، سابق پروفیسر اقتصادیات کیننگ کالج لاہور

۱

کون انکار کر سکتا ہے کہ دنیا کی یہ عالمگیر جنگ جسکے شاندار خاتمہ نے اتحادیوں کے سر فتح کا سہرا باندھا یہ ایک ایسی جنگ تھی جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، اور ایسی جنگ تھی جس نے کروڑوں روپیہ اور لاکھوں قیمتی جانوں کا بھینٹ لے لیا۔ ایک زمانہ درکار ہوگا جبکہ ۵۰ ہزار ملین[1] پونڈ کے قرضہ کے بار سے جسکا سُود ۵ فیصدی کے حساب سے ۲۵۰۰ ملین پونڈ ہوتا ہے اور جو گورنمنٹ ہند کی سالانہ آمدنی سے پچیس گنا زیادہ ہے سبکدوشی حاصل ہو اور دنیا کی دولت کے تحفظ کا اطمینان کیا جا سکے۔

لیکن یہ جنگ مثل دوسرے عذابوں کے نعمات سے خالی بھی نہ تھی، ہندوستان کو جنگ نے کیا نعمات بخشیں؟ یہی ہمارا موضوع ہے ہمارے کوشش ہو گی کہ ہم ان نعمات کے اقتصادی پہلو پر بحث کریں اور یہ دکھلائیں کہ ہمارے، تقدیر کی وہ تحریر جسمیں ہمکو "لکڑی کاٹنے والے اور پانی کھینچنے والے" لکھا ہوا ہے اب حرف غلط کی طرح مٹ چکی ہے اور ہماری تاریخ کا وہ باب کھل گیا ہے جس میں ہمارے وہ کارنامے جگہ پا سکینگے جو یقیناً ہماری قدیم تمدن و تہذیب اور روایات کے سزاوار ہونگے، ہم اب لیگ اقوام کا ایک رکن ہیں، ہم دنیا کی آتش جدال و قتال کے بجھانے کے ذمہ دار ہیں ہم ان میں ہیں جنھوں نے دنیا کی دائمی امن و آمان کے معاہدہ پر دستخط کئے اور اسکی تکمیل میں حصّہ لیا، ہندوستان پر جنگ کے اقتصادی اثرات دکھلانے میں ہمارا فرض ہو گا کہ ہم جنگ سے پہلے اپنی صنعت و حرفت کی حالت کا آئینہ پیش کریں پھر یہ دکھلائیں کہ دوران جنگ میں ہندوستان کو "ہیاٗ" میں ایک مفید ترین جزو بنانے ۔ اور اسکے وسائل کو وسیع کرنے اُسکی صنعت و حرفت کو نشو و نما دینے کیلئے

---

[1] ایک ملین = دس لاکھ، ۵۰ ہزار ملین پونڈ بحساب ایک پونڈ = تیرہ روپیہ ۶۵۰۰۰۰ کروڑ روپیہ کے برابر ہوئے

کیا کیا گیا ہو۔ آخر میں اس نکتہ پر روشنی ڈالنا ضروری ہے کہ ہماری صنعت و حرفت کے مستقبل کو کیونکر درخشان بنایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے! کون نہیں جانتا کہ برّ اعظم ہند ایک زراعتی برّ اعظم ہے؟ مشینری اور اسٹیم کے دور کے پہلے ہندوستان نہ صرف زراعتی ملک تھا بلکہ حرفتی بھی، اور پھر زراعت و حرفت دونوں میں اپنی عزت کو برقرار رکھنے والا، لیکن مشینری نے اسکی قسمت کے پانسہ کو الٹ دیا۔ اس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ وہ مشینری کی تاب مقابلہ نہ لا سکا، لیکن اسکے لیے یہ کیا کم باعث فخر ہے کہ وہ اس کشمکش میں بھی حقیقی معنی میں اپنے تئیں حرفتی بنائے رکھنے میں کامیاب ہو گیا، جبکہ دنیا کی صناع قوموں نے اسٹیم گیس اور بجلی کی مدد سے مشینری کا استعمال شروع کر دیا وہ اپنے قدرتی وسائل کی مدد سے انسانی دست و بازو کی قوت کو کام میں لاتا رہا۔

یورپ کا حرفتی انقلاب اور اسکا اثر ہندوستان پر یورپ کے حرفتی انقلاب نے جس نے یورپ کی صنعت و حرفت کی تاریخ بدل دی ۱۷۶۰ء سے انگلستان میں اپنی داغ بیل ڈالنا شروع کی تھی، اسی انقلاب کے اثرات ۱۸۵۰ء تک ہندوستان میں رونما نہیں ہوئے تھے لیکن ہم اتنا ضرور بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ جب ہمارے ملک کی عنان حکومت "تاج برطانیہ" کے ہاتھوں میں گئی تو رفتہ رفتہ خاموشی، و سکون جو ہندوستان کا طغرائے امتیاز تھا رخصت ہونے لگا اور اسکی جگہ یورپین زندگی کی خصوصیات یعنی اضطرار، مصروفیت اور مقابلہ، لینے لگے،

لہ ایک براعظم میں جو لوازمات پائے جانا چاہیے وہ موجود ہیں لہٰذا ہندوستان بھی یقیناً براعظم کہے جانے کا مستحق ہے۔ (مدیر مرتب)

کہ اس امر سے انکار کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کسی دور میں ایک حرفتی ملک تھا اگر حرفتی کا لفظ آجکل کی اصطلاح میں استعمال کیا گیا ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ یورپ بھی کبھی حرفتی نہ تھا لیکن اگر ہم ایک صدی قبل کے نام نہاد ممالک عالم کی طرف نظر کریں تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان تمام ممالک مشرقیہ و مغربیہ میں ایک خاص امتیاز رکھتا تھا، وہ اپنے مصنوعات سے نہ صرف اپنے کروروں باشندگان کی ضروریات فراہم کرتا تھا بلکہ ضرورت سے زیادہ اشیا کو دنیا کے ان ممالک میں پہونچاتا تھا جہاں انکی بہت قدر و منزلت کیجاتی تھی۔

سب سے پہلے اس انقلاب کے جراثیم ہماری بندرگاہوں میں پیدا ہوئے پھر رفتہ رفتہ یہ وبا سارے ملک کے قالب میں سرایت کر گئی، ہندوستان نے اسکا خیر مقدم ہرگز نہیں کیا کیونکہ یہ ہماری صدیوں کی محبوب زندگی و روایات کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا تھا، ہندوستان نے اس انقلاب کو اپنا غنیم سمجھا اور بجائے اسکے کہ وہ اسکو اپنے تحفظ کے لیے ایک مفید حربہ بناتا وہ خاموشی سے رفتار زمانہ کو دیکھتا رہا اور تمام اُن نقصانات کا جو اسکو اپنی خاموشی کے بدولت برداشت کرنا پڑے متحمل رہا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اسکے دست و پا مفلوج ہوتے گئے اور وہ اپنے کھسیان پن میں اپنی روایات۔ طرق و رواسم کی لکیر کو پیٹتا رہا۔

انقلاب کیطرف میلان یہ ابھی کل کی بات ہے کہ ہندوستان نے اپنے صنعت و حرفت میں جن طریقوں کی طرف میلان طبیعت کا اظہار کیا ہے وہ اس انقلاب کی جلو میں آتے ہیں۔ اب ہندوستانیوں نے اپنے تحفظ کی عملی تدابیر سوچنا شروع کیں اور انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے لئے ایک حرفتی ملک بننے کیلئے ضروری ہے کہ وہ لوہے۔ کوئلے اور دوسری معدنیات بھی مہیا کرے۔ اسکے ہونہار فرزند علوم جدیدہ کا مطالعہ اور انمیں تحقیقات کریں، کیونکہ یہی حربے تھے جنکے توسط سے دنیا کی دوسری قوموں نے اس عالمگیر حرفتی انقلاب کی قوتوں کو اپنے زیر تسلط رکھا ہے۔

حرفتی ترقی کے لوازمات اور ہندوستان کی بے استطاعتی بیسویں صدی میں دنیا کی تمام حرفتی قوموں کی تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ ہر ملک کے حرفتی نشو و نما کا دار و مدار کثیر سرمایہ، مشینری، تربیت یافتہ مزدور، ہوشیار منتظمین پر ہے پھر اسکے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ منتظمین دل و جان سے اُس کام میں مصروف ہو جاویں اور داخلی و خارجی کفائتوں[ط] کو اپنے قبضہ میں رکھیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان کا ابھی کسی میں بھی شمار نہیں۔ نہ اسمیں اتنی استطاعت ہے کہ وہ جاپان کی طرح جلد سے جلد شاہ راہ ترقی پر گام زن ہو سکے ہم ابتک کارہائے نمایاں کیوں نہ دکھلا سکے؟ یہ سوال ہے جو یقیناً ہماری توجہ کا محتاج ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم نے سب کے آخر میں ترقی کے میدان میں قدم رکھا، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم دوسری قوموں سے دوڑ میں سبقت لیجا سکیں، ہم نے نہ معدنیات کا مطالعہ کیا، نہ کسی اور اسکے متعلق علم میں بصارت حاصل کی۔ ہم اُس مسافر کی طرح چل کھڑے ہوئے جسکے پاس توشہ تک نہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اُن خام اشیا کا جنکو ہم دوسرے ممالک میں تیار شدہ اشیا کے بدل میں بھیجتے تھے کچھ بھی استعمال کر سکے۔ دوسرے الفاظ

ط Internal and external economies.

میں تگ ودو کی لیکن جہاں تھے وہیں رہے۔

ہندوستان میں معدنیات، انجینیری، ادویہ ـ وغیرہ وغیرہ کی تعلیم ہنوز گہوارۂ طفولیت میں ہے ـ ایسی ضروری تعلیم کے آغاز کا سہرا سرجے ان ٹاٹا کے سر ہے جنھوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں بنگلور اور پکی میں انکی بنیاد ڈالی، ایسے ہنگام میں جبکہ ہم مشین بنانے میں قاصر تھے ہمکو صنعتی علم کیمیا[۵۲] سے حس نہ تھا، ہمارے پاس اوّلاً سرمایہ کافی نہ تھا اور اگر تھا بھی تو ہمکو اُسکے لگانے میں تامل تھا، اور سب پر طرہ یہ کہ سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں بنکوں کا انتزاع[۵۳] بھی تھا ـ پھر ایسے حالات کے ماتحت جب جنگ کا شعلہ بھڑکا تو ہماری بدقسمتی اور بدنصیبی کہ ہم اس عالمگیر آگ سے کچھ بھی فائدہ نہ اٹھا سکے ـ ہم نے نہ اسکی تحقیق کی تھی کہ کن چیزوں کی ضرورت جنگ میں ہوگی اور انکا کیا مصرف ہوگا، کن کاموں کیلیے وہ ... زوں ہونگی اور کیونکر تیار کیجا سکیں گی؟ ہمارا خزانہ قدرتی وسائل سے مالا مال تھا لیکن سب عبث، ہم ان وسائل کا استعمال کیا کرسکتے تھے؟ ایسے موقع پر اگر کچھ کام آسکتے تھے تو وہ ہمارے دست و بازو لیکن کیا مشینری کے مقابلہ میں ہ بیشک مگر صرف اُن مقامات پر جہاں مشینری نسبتاً گراں ٹھہرتی ہو،،

گورنمنٹ کی آزاد تجارت کی پالسی کا اثر[۵۴]

ہندوستان جیسا کہ عام عقیدہ ہے ایک زراعتی ملک ہے اور ہے بھی بیشک، زراعت کا انحصار بارش پر ہے اور بارش ناقابل اعتبار ہے لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ زراعت بھی ناقابل اعتبار ہے یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کی بنیاد نا پائدار چیز پر نہیں ہوسکتی پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ زراعت زرخیز ہو جائے؟ گذشتہ چالیس سال سے ہندوستان تدریجاً زراعت پیشہ ہوتا چلا جاتا ہے سنہ ۱۸۷۱ء میں ملک کی آبادی میں سے پچاس فیصدی باشندگان کی بسر اوقات کا انحصار زراعت پر تھا ـ اگر سنہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار قابل وثوق ہیں تو زراعت پیشہ باشندگان کی تعداد سنہ مذکور میں ۷۲ فیصدی ٹھہرتی ہے،

---

۵۱ بمبئی پورکا اصلی نام

۵۲ Industrial chemistry

۵۳ Banking crisis 1913-14

۵۴ Free Trade policy of the government

اعداد و شمار آبادی جو زراعت میں مصروف ہے

	۱۸۹۱ء	۱۹۰۱ء	۱۹۱۱ء	زیادتی		
				از ۱۸۹۱ء تا ۱۹۰۱ء	از ۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۱ء	از ۱۸۹۱ء تا ۱۹۱۱ء
برٹش انڈیا	فی صدی ۶۲	فی صدی ۶۸	فی صدی ۷۳٫۵	فی صدی ۶	فی صدی ۵٫۵	فی صدی ۱۱٫۵
دیسی ریاستیں	۵۷	۶۰	۶۷٫۸	۳	۷٫۸	۱۰٫۸

ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اولاً زراعت پیشہ بننے کی رفتار برٹش انڈیا میں دیسی ریاستوں کے اعداد سے دوگنی تھی پھر دیسی ریاستوں نے پچاس فی صدی کی رفتار سے زراعت پیشہ بننا شروع کیا، دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ گذشتہ بیس سال میں ۱۱٫۵ فی صدی برٹش انڈیا اور ۱۰٫۸ فی صدی دیسی ریاستیں زراعت پیشہ بنگئی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ابھی تک دیسی ریاستیں ۵٫۷ فی صدی برٹش انڈیا کے باشندگان سے پیچھے ہیں۔

(باقی دارد)

خالق باری

اردو کے منظوم لغت

(بقلم مسٹر سید مسعود حسن رضوی، ادیب ایم اے لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی)

حضرت امیر خسرو کو جس طرح اور بہت سی چیزوں میں اولیت کا شرف حاصل ہے، اسی طرح اردو کا سب سے پہلا لغت لکھنے کا فخر بھی انھیں کے لئے حاصل ہے، اب تک اردو کا کوئی ایسا منظوم لغت دستیاب نہیں ہوا جو خالق باری سے زیادہ قدیم ٹھہرتا، مولانا محمد حسین آزاد مرحوم آب حیات میں تحریر فرماتے ہیں:-

"افسوس ہے کہ خالق باری کا کوئی بہت قدیم نسخہ نہ ملا جو اس قول کی تصدیق کر سکتا مجھے جو پرانے سے پرانا نسخہ ملا ہے اس کی تاریخ تحریر ۱۲ شعبان ۱۱۷۱ھ یعنی اس کی عمر سوا سو برس سے زائد نہیں ہے، مگر کتاب کی تصنیف کو کوئی ساڑھے چھ سو برس ہو چکے ہیں، اسلئے یہ نسخہ بھی قدیم نہیں کہا جا سکتا۔"

عام طور پر مشہور ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے، مگر جو لوگ تحقیق کی دھن میں کسی بات کو بغیر کافی ثبوت کے نہیں مانتے، اور کسی بات کی شہرت کو اسکی صحت کی دلیل نہیں جانتے انھیں اس بارے میں بھی شک تھا۔ لیکن خالق باری کے اردو لفظوں اور فقروں کی قدامت بعض ایسے لفظوں کی موجودگی جو امیر خسرو کے بعد متروک ہوگئے۔ امیر خسرو کا ہندی اور فارسی پر یکساں عبور رکھنا اس زمانہ میں اس طرح کے کسی دوسرے مصنف کا موجود نہ ہونا۔ امیر خسرو کی ایجاد خیز طبیعت اور کتاب کی آخری بیت میں امیر خسرو کے تخلص کا نہایت حسن سے آنا۔ یہ سب باتیں عام رائے کی تائید کرتی ہیں اور امیر خسرو ہی کو خالق باری کا مصنف ثابت کرتی ہیں۔

خالق باری ایک منظوم لغت ہے جس میں فارسی عربی اور ہندی کے ہم معنی الفاظ جو روزمرہ کی بات چیت کے لئے ضروری تھے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح کا منظوم لغت امیر خسرو کی ایجاد نہیں ہے، سنسکرت میں ایسے لغت

خالق باری سے بہت پہلے تصنیف ہو چکے تھے۔ فارسی میں بھی کم سے کم ایک ایسی کتاب اس سے پہلے ضرور موجود تھی اور اسکو جو عام مقبولیت ہندوستان میں ابھی کچھ دن پہلے تک حاصل تھی وہ اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ امیر خسرو کی نظر سے وہ کتاب ضرور گذری ہوگی میری مراد کتاب نصاب الصبیاں سے ہے جو ابو نصر محمد بدرالدین ہی نے ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں تالیف کی تھی۔

یہ امر بالکل قرین قیاس ہے کہ امیر خسرو کو خالق باری لکھنے کا خیال اسی کتاب کی بدولت پیدا ہوا ہو نصاب الصبیاں کیطرح خالق باری میں بھی مختلف بحروں کے مختلف قطعے ہیں، یہ مشابہت بھی میرے خیال کی تائید کرتی ہے، امیر خسرو کی ہر تصنیف کیطرح خالق باری بھی بہت مقبول ہوئی، اسکے بعد اس طرز کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، مگر باوجود اسکے کہ وہ رائج الوقت زبان میں ہونے کیوجہ سے خالق باری سے کہیں زیادہ مفید تھیں اور خالق باری کی قدیم زبان پڑھنے والے تو درکنار پڑھانے والے بھی نہ سمجھ سکتے تھے پھر بھی اُن کتابوں کو وہ قبول عام نصیب نہ ہوا جو خالق باری کو چھ سو برس سے زیادہ حاصل رہا، خالق باری کے طرز کی جتنی کتابیں لکھی گئیں اُن کا مقصد بالعموم یہ تھا کہ ہر وقت استعمال میں آنے والے لفظ یکجا کر کے نظم کر دیے جائیں تاکہ بچوں کو ان کے یاد کرنے میں آسانی ہو مگر خالق باری اصل میں بچوں کے لئے نہیں لکھی گئی تھی امیر خسرو کے زمانہ میں چنگیزیوں کی تاخت و تاراج نے ایران و توران کو زیر و زبر کر دیا تھا ان کے جدال و قتال سے تنگ آکر ہزارہا ایرانیوں اور تورانیوں نے ایران میں آکر پناہ لی تھی۔ ان لوگوں کو ہندوستانیوں سے بات چیت کرنے میں بہت دقت پڑتی تھی نہ وہ ان کی بات سمجھتے تھے نہ یہ ان کی اس دقت کو دور کرنے کے لئے امیر خسرو نے فارسی اور ہندی کے ضروری ہم معنی الفاظ یکجا کر کے نظم کر دیے تھے۔ جس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے امیر خسرو نے خالق باری تصنیف کی تھی وہ ضرورت اب باقی نہ رہی تھی۔ نہ پرانا طریقہ تعلیم ہی باقی رہا تھا، اس سے خالق باری کی شہرت عوام میں روز بروز کم ہوتی گئی اور جائے گی، لیکن چونکہ ادبی تحقیق کا ذوق اور زبان اُردو کی تاریخ جاننے کا شوق بڑھ رہا ہے اسلئے خواص میں اسکی وقعت دو حیثیتوں سے بڑھ جائے گی، ایک تو یہ کہ اسمیں آج سے ساڑھے چھ سو برس پہلے کی اردو کے نمونے زیادہ موجود ہیں اور دوسرے یہ کہ اردو کا سب سے پہلا لغت ہے۔

خالق باری کی وجہ تسمیہ تو ظاہر ہے جس طرح شیخ سعدی شیرازی کا پندنامہ اور شیخ علاء الدین خراسانی

کا ترجیع بند اپنے اپنے ابتدائی لفظوں کی بنا پر کریما اور مقیما کے نام سے مشہور ہو گئے، اسی طرح خالق باری کے ابتدائی دو لفظ اسکا نام قرار پا گئے، لیکن یہ معلوم نہو سکا کہ خود امیر خسرو نے اسکا کیا نام رکھا تھا، اتنا تو ضرور پتہ چلتا ہے کہ آج سے کوئی تین سو برس پہلے بھی یہ کتاب خالق باری ہی کے نام سے مشہور تھی۔

"اللہ خدائی"، نمبر ۲ فہرست ہذا کہ جسکا ذکر آگے آئے گا سنہ ۱۰۰۱ ہجری کی تصنیف ہے اسکے مصنف تجلی نے کتاب شروع کرتے وقت امیر خسرو کی روح سے مدد مانگی ہے اور خود اپنی تصنیف کا نام اللہ خدائی رکھا ہے" ان دونوں باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بھی امیر خسرو ہی کا ہندی اور فارسی لغت منظوم موجود تھا اور اسکا نام بھی خالق باری ہی تھا، تجلی نے جس طرح منظوم لغت لکھنے میں خالق باری کا انداز اختیار کیا اسیطرح اسکا نام بھی "خالق باری" کے طرز پر اللہ خدائی رکھا ورنہ ظاہر ہے کہ کتاب کا یہ نام رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی کیونکہ اس نام کو کتاب سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

خالق باری کے تمام مطبوعہ نسخوں میں ایک سو بانوے بتیس ہیں لیکن جو پرانا قلمی نسخہ میرے پاس ہے، اسمیں یہ بیت نہیں ہے

راہ، سبیل، طریق، پہچان | ارتھ تھو کا مارگ جان

اس طرح اسمیں صرف ۱۹۱ بتیس ہیں۔ ذیل میں ابتدائی تین بتیس نمونہ کے طور پر لکھتا ہوں

خالق، باری، سرجن ہار | واحد، ایک، خدا، کرتار

رسول، پیغمبر، جان بسیٹھ | یار، دوست بولی جا ایٹھ

اسم اللہ، خدا کا ناؤں | گرما دھوپ، سایہ ہے چھاؤں

باقی دارد

نوشتہ مرزا جعفر علی خان صاحب آثر بی۔اے۔ ڈپٹی کلکٹر ناؤ

مقدمہ

جو ڈرامہ پیش کیا جاتا ہے اُس عہد کا ہے جبکہ باشندگان ایوُلیا (Aeolians) انشا پردازی میں بقیہ یونان سے ممتاز اور آسمان ادَب پر مہر نیمروز کی طرح چمکتے تھے، اُن کی شاعری کی خیرہ کن شعاعوں نے دنیائے ادَب کو روشن و منوّر کر دیا تھا، وہ ایسے عمیق جذبات سے مالا مال تھی کہ اُسکے مقابلہ میں ڈورئین (Dorians.) اور آئونین (Ionians) کبھی گوئے سبقت نہ لیجا سکے، ایئولیا (Aeolian) کی شاعری کا مرکز جزیرہ لسباس (Lesbos) تھا جہاں کے باشندے نہایت ذہین و طبّاع ہوتے تھے ان کے جذبات کی دھونکنی قوم یونان کے احساسات کی آگ کو تیزی مگر استقلال کے ساتھ مشتعل کر رہی تھی۔ جن قوتوں کو اہل آئونیا (Ionia) فراہمی اسباب عیش و راحت، اقتصادیات، تجارت وضع قوانین، سائنس اور فنون لطیفہ کی پرداخت میں اور ڈورئین (Dorians) حرب و ضرب و تمدن و تدبر میں صرف کرتے تھے، ائولین جذبات کی برانگیختگی کے لئے محفوظ رکھتے تھے یہ جذبات آتش فشاں پہاڑ کی طرح اندر ہی اندر سلگا کرتے تھے اور آخر کار شعلہ بار ہوتے تھے، تاریخ یونان کے کسی دَور میں اور ملک یونان کے کسی حصّہ میں حسن و تناسب اعضا کا خیال، دلفریب مناظر کا احساس، جذبات کی دہکتی ہوئی آگ نہ اسقدر قوی تھی اور نہ اس انوکھے انداز میں اسکا اظہار ہوا جیسا کہ لسباس میں جذبات کی فراوانی و دل آویزی کی ایسی مثال دنیا بھر میں نہیں ملتی۔

یہ ائیولین (Aeolian) کے اَوجِ کمال کا زمانہ تھا اُن کا حیرت انگیز لیکن سریع الزوال موسم بہار تھا۔ مگر اس شاعری کا ثمر ترش و متعفن تھا۔ رفتہ رفتہ لباس عیاشی و غلط کاری کا مرادف ہوگیا۔ اُن آتشین جذبات نے جو ایک وقت فنون لطیفہ کی جان تھے الفاظ کے لفافے کو جلا کر خاک کر دیا اور عملی صورت میں نفس پرستی کی بھٹی بن گئے جس سے اُن صفات یزدانی کے شیوع کی جو انسان میں ودیعت ہیں اُمید ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اہل لباس کی بعینہ وہی حالت ہوئی جو پرَوونسال (Provencal.) کے ٹرو بیہ دور (Troubadours) کی جو آخر سر آخر محض خواہشات نفسانی کے اُبھارنے کو شاعری کرتے تھے، یا وینس (Venice.) کے مُصوّروں کی جنکا کمال رنگوں کی خوشنمائی یا جسمانی خوبصورتی میں گھر کر رہ گیا تھا، روحانیت مفقود ہوگئی تھی اور مُصوّری کا منشا صرف نفسانیت کو ہیجان میں لانا تھا۔ جب تک جذبات آلودگی سے پاک رہے دُنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور خراج تحسین لیا۔ لیکن اُدھر جذبات میں فرق آیا اُدھر فنون لطیفہ کا سرسبز گلزار خواہشات کے تند جھوکوں سے مرجھانے لگا اور وہ انحطاط شروع ہوا جسکا نام خواہش پرستی ہے ؛

عشقیہ شاعری نے جو لسباس میں ابتداءً ایسی نمایاں ترقی کی اُس کے کئی وجوہ ہیں:-
ائیولین (Aeolian.) کے رسم و رواج ایسے تھے کہ آپس میں ارتباط اور تبادلۂ خیالات کا بہ نسبت دیگر یونانیوں کے زیادہ موقع تھا، پردہ کا رواج نہیں تھا، نہ وہاں کے مرد اتنی سختی سے اپنی مستورات کی نگرانی کرتے تھے جیسی کہ اہل اسپارٹا آئونیا (Ionia) میں اُس وقت بھی پردہ رائج تھا، مگر لسباس کی عورتیں آزادی کے ساتھ مردوں سے ملتی تھیں، تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور انھیں اظہار خیالات کی اتنی آزادی حاصل تھی کہ تاریخ قدیم یا جدید میں مشکل سے اسکی مثال ملے گی، انشاپردازی ان کا شغلہ تھا، کلب قائم کئے تھے، جہاں شاعری و موسیقی کی تعلیم دیجاتی تھی وہ تمام فنون لطیفہ میں نہ صرف دستگاہ حاصل کرتی تھیں بلکہ بحور و اوزان کی درستی و صفائی اور انداز بیان کو دلکش بنانے میں کوشاں رہتی تھیں چنانچہ خود "سیفو" ایک بحر کی موجد ہے جو اُس کے

نام کی رعایت سے سیفک ([illegible]) کہلاتی ہے، چونکہ انھیں کسی قسم کی روک ٹوک نہیں تھی اور حسن کی مقتول تھیں ان کے مساعی ادب کے علمی پہلو تک محدود نہ تھے، وہ اپنے خیالات وجذبات کو علمی جامہ پہناتی تھیں

تمام نعمتیں اور راحتیں جو لباس کی آب و ہوا اور اس کی زرخیز وادیاں مہیا کر سکتی تھیں، ان عورتوں کو نصیب تھیں، خوشنما باغ جہاں گلاب و حنا کی خوشبو سے مشام جاں معطر ہوتا تھا، انار نارنج کے تختے جن سے دامن دریا میں گویا آگ لگی رہتی تھی آبشار اور زیتون کے درخت جن کے نیچے مختلف رنگوں کے پھول اپنی اپنی بہار دکھاتے تھے، پہاڑوں کی کھوئیں جنپر درخت سایہ فگن تھے، اور جنکے پائین سمندر میں ہلکا ہلکا تموج رہتا تھا؛ جہاں دراندازنگاہوں سے محفوظ دوشیزہ کر غسل کرتی تھیں، درختوں کی ڈالیاں ان میووں سے لدی رہتی تھیں جو صرف جنوب میں پیدا ہوتے ہیں، سنگ مرمر کی چٹان جن پر پھول نگینوں کی طرح جڑے رہتے تھے جو خوشبودار نباتات سے مہکتے تھے؛ جہاں بلبلیں نغمہ سرا تھیں، جہاں سونے سے لپے ہوئے مندر تھے۔ جن میں ہاتھی دانت کی پچیکاری تھی، جہاں گذشتہ بہادروں کے بت نصب تھے ٭

ایسے مقام میں لباس کے شاعر اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور بیداری میں عشق و حسن کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ جب ہم ان کے اشعار پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ارض عیش و راحت کی خوشبوؤں، رنگوں، آوازوں اور روشنیوں کا عطر نظم میں کھینچ لیا ہے، یہاں کا جاڑا شدید مگر دیرپا نہیں ہوتا تھا، لہذا ان لوگوں میں سستی و کاہلی پیدا ہونے نہیں پاتی تھی، بلکہ موسم بہار کی کیفیت دوبالا ہو جاتی تھی، شاید اسی وجہ سے اٹولیا ([illegible]) کی شاعری میں اس درجہ شیرینی اور گھلاوٹ ہے اور کلام تصنع سے پاک ہے شاید اسی سے ([illegible]) چنگ اٹولیا اب تک یادگار ہے؛ خصوصاً سیفو کی نظمیں جنمیں تخئیل و طرز ادا اس طرح شیر و شکر ہیں کہ دونوں درجہ کمال پر نظر آتے ہیں۔ شاعری جذبات کی تکمیل کرتی ہے اور جذبات شاعری کو معراج کمال پر پہونچاتے ہیں، افسوس کہ اس لاجواب شاعرہ کا کلام تلف ہو گیا۔ یہ ایسا نقصان ہے جسکی

تلافی ناممکن ہے چند جواہر ریزے جو ہم تک پہونچے ہیں ان کو پڑھ کر حیرت اور تاسف ہوتا ہے
کہ پوری نظمون کی کیا حالت ہو گی ؎

متقدمین میں "سیفو" کی سی شہرت کسی کو نصیب نہیں ہوئی، صرف وہ شاعرہ تھی جس طرح "ہومر"
شاعر تھا، ارسطو نے اُس کے متعلق وہ رائے قائم کی جس سے ہومر اور آرکیلوکس کی ہم پلہ مانی جائیگی
افلاطون نے اُسے دُنیا کے دس عظیم ترین شاعروں میں شمار کیا۔ سولن نے اس کی ایک نظم سُن کر
دُعا مانگی کہ جب تک وہ حفظ نہو جائے اُسے موت نہ آئے اسٹریبو اس کی قوت شاعری کا اِس
ادب سے ذکر کرتا ہے گویا اُسکا جزو مذہب ہے، لانجینس اسکے ایک قصیدہ کو کمال شاعری کے نمونہ
کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اور شاعر اُسے دختر افروڈیٹی دایراس کہتے ہیں، کوئی ملکۂ حسن کا خطاب
دیتا ہے کوئی اپالو کی محبوبہ قرار دیتا ہے، غرضکہ سوا مدح و ثنا کے کسی نے کنایۃً بھی اُس کی
شاعری پر حرف نہیں رکھا ؎

دنیا کے تمام شاعروں، تمام ادبی ساحروں میں صرف "سیفو" ہے جس کے ہر لفظ میں ایک
خاص روح افزا نکہت ہی، جس کے کلام پر کمال کی مہر ہے، وہ لطافت و نفاست ہے جس کی نقل
ممکن نہیں، فن میں بھی اُس سے کبھی لغزش نہیں ہوئی، آرکیلوکس جو بہت مشہور شاعر گذرا ہے اسکے
سامنے طفل مکتب معلوم ہوتا ہے،

سیفو کے حالات زندگانی بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ایسے معتبر نہیں کہ صحیح واقعات کا
اندازہ کرنے میں معین ہوں، کہا جاتا ہے کہ اُسکا ایک بھائی چارا کسس اور ایک لڑکی "کلیس" تھی
"الکس" اُس سے محبت کرتا تھا اور وہ "فے آن" پر فریفتہ تھی۔ ایٹس اور اناکٹوریا سے بھی لگاؤ تھا
اُس نے ایک پہاڑی سے کود کر جان دے دی، اسکی شہرت و عظمت کا اس سے بہتر ثبوت نہیں ہو سکتا
کہ محض اس واقعہ کے سبب سے اِس پہاڑی کو تاریخی اہمیت حاصل ہوگئی، اصلیت جو کچھ ہو اسکی شاعری ایسے
جاں سوز جذبات سے لبریز ہے جسکے سامنے اسکی زندگی کے واقعات دھندلے اور بے وقعت نظر آتے ہیں۔
بجز چند ایرانی یا فرانسیسی عشقیہ نظموں کے جذبات کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں

صفحۂ دنیا پر نظر نہیں آتیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک گہری روح ہے جو حسن کی متجسس ہے ایسے حسن کی جو عالم ایجاد میں موجود نہیں لیکن جو بہترین شاعروں کے شعلۂ عشق کو مشتعل کرتا رہتا ہے ان کی نیند لوٹ لیتا ہے اور خون کے آنسو رلاتا ہے' سیفو کی شاعری کے جو نمونہ موجود ہیں' ان سے واضح ہوتا ہے کہ جذبات کا اظہار الفاظ میں اس سے بہتر کسی نے نہیں کیا'۔

وہ ایسے ہیرے' یاقوت' زمرد' اور لآلی آبدار ہیں جن میں روح کا نور ہمیشہ کے واسطے منجمد ہو گیا ہے ۱۶۰ برس قبل مسیح "سیفو" کی پوری شہرت ہو چکی تھی' اس طرح وہ گوتم بدھ کے بھی بیشتر زندہ تھی' چند نمونے اس کی شاعری کے جو دوسرے مصنفوں نے اپنی کتابوں میں نقل کئے اور اس طرح محفوظ رہے انگریزی سے ترجمہ کیے جاتے ہیں :۔

(۱) بھجن ایفروڈیٹی کی تعریف میں :۔

" لافانی ایفروڈیٹی! (ملکۂ حسن) جو منقش تخت پر متمکن ہے' زیوس (آفتاب) کی بیٹی! ناز و کرشمہ کی موجد! افسوں ساز ایفروڈیٹی! اے ملکہ! میں تیرے حضور دست بستہ عرض کرتی ہوں کہ میری روح کو مصائب و آلام کا شکار نہ بنا' میرے پاس آ' تو نے پہلے بھی دور سے میری آواز سنی تھی اور اپنے پتا کے سنہری محل کو چھوڑ کر آئی تھی' جسے خوبصورت اور تیز پرواز ابابیلیں کھینچتی تھیں' وسط فضا میں اپنے بازوں کو تاریک دنیا کے گرد جلد جلد کھولتی اور بند کرتی تھیں مجھ تک آن واحد میں پہنچ گئی تھی' اے پاک دیوی! تیری زندگی جاوید بخشنے والے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ تو نے مجھ سے پوچھا "اب کیا مصیبت پیش آئی؟ مجھے کیوں بلایا ہے؟ تیرے کمزور دل میں کون تمنا ہے؟ کس خوبرو پر مرتی اور اس سے محبت کی امید رکھتی ہے۔ سیفو جو تجھ سے بیزار اور مائل آزار ہے' تیرے پاس خود دوڑ آئے گا۔ تو اپنا ہدیۂ محبت پیش کرتی رہ۔ اسکی سرد مہری سے دل شکستہ نہو' رفتہ رفتہ وہ خود آتش عشق میں جلنے لگے گا پھر تو ملامت بھی کریگی تو خفا نہو گا"

اے جلیل القدر ملکہ! کیا تو نے یہ نہیں کہا تھا؟ ایک مرتبہ پھر رحمت کر' میری سن لے' میری آتش غم کو بجھا' میری مراد بر لا"

(۲) ادھر ماہ کامل نے اپنی سیمیں شعاعوں سے روے زمین کو منور کیا ادھر ستاروں نے جو اسکے قریب تھے

شرم سے اپنے چہرے چھپا لیئے!

(۳) سیب کے درخت کی شاخوں سے نسیم ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی اُٹھی، پتیاں کانپ اُٹھیں نیند آگئی

(۴) میں جنکے کام آتی ہوں وہی زیادہ دکھ دیتے ہیں!

(۵) پیک بہار!، عندلیب خوشنوا !

(۶) عشق میرے اعضا وجوارح پر قابو پا گیا ہے اور بند بند ہلائے دیتا ہے ظالم عشق! شیریں تلخ!

(۷) سیاہ آنکھوں والی نیند، شب کی آفریدہ!

(۸) اُس خوبصورت سیب کی طرح جو سب سے بلند شاخ پر پکتا ہے جسے توڑنے والے بھول جاتے ہیں، نہیں! بھول نہیں جاتے بلکہ اُس تک پہونچ نہیں سکتے!' اِن خودرو پھولوں کی طرح جو پہاڑوں پر اُگتے ہیں اور جنھیں چرواہوں کے قدم روندا کرتے ہیں جو زخمی ہوتے ہیں کچل کچل کر فنا ہوجاتے ہیں!

(۹) اے رات! میرے لیئے دونی ہوجا۔

الکزنڈر گرل پارزر آسٹریلے کے مشہور شاعر نے تاریخی واقعات کی بنیاد پر ایک عجیب خوشنما عمارت تخیلی کی اٹھائی ہے اور سیفو کے متعلق ایک ڈرامہ لکھا ہے، میں نے اسکے ترجمہ کی نہیں بلکہ یہ کوشش کی ہے کہ انھیں جذبات کو اردو میں دُہراؤں۔ اصل ڈرامہ کی دلکشی قائم رکھنے میں مجھے کامیابی ہوئی یا ناکام رہا اسکا فیصلہ اہل نظر کرینگے۔ ترجمہ کی حیثیت سے جو صاحب ملاحظہ فرمائینگے انھیں مایوسی ہوگی، کیونکہ مصنف کے خیالات کو ذہن نشین کرنے کے بعد میں نے حوالۂ قلم کردیا ہے بسا اوقات اصل عبارت سے کوئی واسطہ نہیں رکھا بلکہ نمایاں ردوبدل کی ہے۔ یہ امور ترجمہ کی عبارت سے خود واضح ہوجائینگے "

(باقی دارد)

از لکھنوی

نوائے آزادؔ

شمس العلما مولانا سید محمد حسین صاحب آزادؔ مغفور کی ایک غیر مطبوعہ غزل کے چند منتخب اشعار

دکھا کمال کے جوہر، ہے کچھ اگر لینا — صلہ محال ہے، یاں آکے بے ہنر لینا

معاملہ بھی ہے کیا صاف دین و دنیا کا — اِدھر کے ہاتھ سے دینا ہے، اور اُدھر لینا

وہاں جہل کا ہے چھپانا بہت مشکل — بلائے سخت کا آساں ہے جان پر لینا

گرا جو اشک زمیں پر نہ ہاتھ آئے گا — دلا سنبھال کے آنکھوں سے یہ گہر لینا

خدا کے واسطے آوارہ پھر نہ پیکِ خیال — کہ ہے تجھی سے مجھے کارنامہ بر لینا

خیالِ دولتِ دنیا کو دیجو دل میں نہ جا — کہ چاہتا ہے یہ مہمان بن کے گھر لینا

گزارِ تیغِ اجل کا ہے فکر کیا آزادؔ!

کہ دم کی بات ہے جب چاہو جب گزر لینا

ف ۱ مکمل غزل جناب آغا محمد طاہر صاحب نبیرۂ مغفور کا عطیہ ہے جو اصل (یعنی آزادؔ کے قلم کی لکھی ہوئی) سے نقل کر کے ہم کو بھیجی گئی ہے اور اس عقیدہ کے ساتھ شایع کی گئی ہے کہ یہ آزادؔ کی ہے یہ کس دور کا کلام ہے اِس کے متعلق مرحوم کے پسماندگان خاموش ہیں۔ لیکن کلام کا انداز مطلع اور مقطع کے تیور بتلا رہے ہیں کہ یہ ہمارے نثار شاعر کی اُس زمانہ کی فکر ہے جبکہ اس کے دل میں اپنے کمال کے جوہر دکھلانے کی تمنا پوری نہ ہوئی تھی اور اس کو موت کی زیادہ فکر نہ تھی، مقطع کے آخری مصرع کا آخری ٹکڑا

"جب چاہو جب گزر لینا"

قابلِ وثوق شہادت ہے۔

(مدیر مرتب)

حیات نباتات

(نوشتہ سید مشرف حسین رضوی، بی ایس سی - (علیگ) ایل - ایل - بی)

ہم اس کائنات میں جو کچھ دیکھتے ہیں یا جو کچھ پاتے ہیں، عام اس سے کہ ہم ایک اس کی کیفیت اور حقیقت سے واقف ہو چکے ہوں یا ابھی انکشاف حقیقت کی حقیقت نہ کھلی ہو وہ سب یا تو ذیحیات ہیں یا غیر ذی حیات، بادی النظر میں یہ شناخت کرنا کہ کوئی شے ذیحیات ہے یا غیر ذی حیات بہت آسان معلوم ہوتا ہی لیکن در اصل ایسا آسان نہیں ہے، اگر کسی شخص سے سوال کیا جائے کہ درخت ذیحیات مخلوق ہے یا غیر ذیحیات، تو وہ غالباً فوراً جواب دیگا کہ حضرت! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، بھلا درختوں میں حیات کے کون سے آثار ملتے ہیں جو میں ان کو خدا کی ذیحیات مخلوق میں شمار کروں. علامات اکل و شرب تنفس افزائش نسل بیرونی اثرات کا حس وغیرہ ہر ذیحیات میں کم و بیش پائے جاتے ہیں لیکن قریب قریب یہ کل نباتات کے طبقے مفقود ملیں گے بہر حال سائنس کے ایک شعبہ یعنی علم نباتات کے مطالعہ کرنیسے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا یہ خیال لاعلمی پر مبنی ہے طبقۂ نباتات کی ہر فرد ذیحیات ہے اور انمیں اثرات حیات نمایاں ہیں جنکو ہر شخص دیکھ سکتا ہے، بشرطیکہ غور و فکر کی زحمت گوارا کرے، ہم باختصار ہر علامت و اثر حیات پر جو نباتات میں رونما ہیں سلسلہ وار بحث چھیڑتے ہیں۔

اکل و شرب کون انکار کر سکتا ہے کہ ہر ذیحیات کی زندگی پانی پر منحصر نہیں ہے اگر ایک وقت بھی پانی میسر نہ آئے تو زندگی بہت کچھ زوال پذیر ہو سکتی ہے، طبقہ نباتات بھی بحیثیت ذیحیات ہونیکے کریم مطلق کے اس بیش بہا لیکن مفت عطیہ یعنی "پانی" سے اپنی ہستی کے مطابق حصہ حاصل کرنیمیں سرگرم نظر آتا ہے۔

نباتات کی کسی فرد کو اسکی جڑ شاخ پتی یا کسی عضو کی تشریح کرکے اسکی ساخت کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر جز نہایت چھوٹے چھوٹے اجزا[۱] سے مرکب ہے ہر مالیکول دوسرے مالیکول سے بوجہ قوت جذب و کشش جو

---

[۱] ان اجزا کو انگریزی میں مالیکول (Molecule) کہتے ہیں۔

خدا نے اُن میں ودیعت فرمادی ہے نہایت درجہ متصل ہے لیکن باوجود اس اتصال کے آپس میں ایک دوسرے کے مابین پانی کی مہین مہین چادریں حائل ہیں اس طرح ہر "مالیکیول" پانی میں لپٹا ہوا ایک دوسرے کے پاس پہلو بہ پہلو بیٹھا ہوا ہے اگر یہ پانی کسی وجہ سے خشک ہو جاتا ہے تو یہ "مالیکیول" سکڑ جاتے ہیں اور درخت کا وہ خاص عضو مُرجھانے لگتا ہے اور اگر فوراً ہی پھر پانی پہنچ جاتا ہے تو وہی "مالیکیول" پانی کو جذب کر کے مثل اسفنج یا بالنگو کے پھول جاتے ہیں اور درخت کے اُس عضو میں دوبارہ سختی عود کر آتی ہے لیکن یہ نتیجہ اُسی وقت حصول پذیر ہے جب تک "مالیکیول" میں پانی جذب کرنیکی صلاحیت باقی ہے اگر ان میں اسقدر انقباض آجائے کہ صلاحیت بھی معدوم ہو جائے تو پانی پہنچانا ہرگز سود مند نہ ہوگا اور درخت سوکھ کر فنا ہو جائیگا۔ اب اسکی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ نباتات کی توانائی و شادابی کا راز یہی پانی ہے۔ یہ نباتات کا شرب تھا۔

علاوہ بریں نباتات کو ضرورتِ آب اسلئے بھی ہے کہ درخت اپنی غذا اس کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں اگر پانی نہ خلق ہوتا تو درختوں کے شکم میں غذا نہ پہنچ سکتی اور شدتِ گرسنگی کیوجہ سے نباتات کی ہر فرد فنا ہو جاتی یہ ضرورت محض نباتات ہی کو نہیں بلکہ حیوانات کو بھی ہے خصوصاً انسان میں کوئی شخص سوکھا آٹا اور کچے چانول اور دال نہیں کھاتا جب تک وہ اسکو پانی میں پکا کر نرم نہ کرلے اور قابل ہضم نہ بنالے اسیطرح ٹھیک نباتات بھی اپنی غذا یعنی معدنی مرکبات کو جب پانی میں تحلیل ہو جاتی ہے جذب کرتا ہے خشک معدنی مرکبات باوجود اس کے کہ وہ مٹی میں سرمہ سے باریک حالت میں مخلوط ہوتے ہیں جڑوں کی جلد میں ہو کر درخت کے اندر نہیں پہنچ سکتے۔ اچھا پھر درخت اپنی غذا کیوں کر حاصل کرتے ہیں یہ نکتہ نہایت دلچسپ ہے

اس موقعہ پر یہ ظاہر کر دینا ہرگز نامناسب نہیں کہ مثل حیوانات کے نباتات میں بھی یہ خاص عضو ہے جس کے متعلق معدہ تک غذا پہنچانے کا کام قدرت نے سپرد کیا ہے، حیوانات میں یہ عضو "منھ" اور نباتات میں "جڑ" کے نام سے موسوم ہے۔ کسی چھوٹے پودے کو زمین سے اُکھاڑ کر دیکھو بیشمار جڑیں دکھائی دیں گی۔ اُن میں اکثر موٹی اور سخت ہوں گی اور بکثرت مثل ریشہ کے مہین مہین ہوں گی۔ یہی مہین ریشہ نما جڑیں اس پودے کے منھ ہیں جنکے ذریعہ سے غذا پودے کے معدے میں پہنچتی ہے۔ کسی جڑ کے نرم مقام
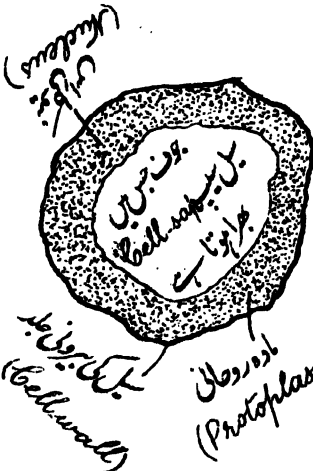
سے حباب سا ورق تراش کر ایک طاقت ور خوردبین کی مدد
سے دیکھو تو اسمیں بہت سے چھوٹے چھوٹے خانے[۵۱] دکھائی
دیں گے جنمیں علاوہ ایک قسم کے مادہ[۵۲] کے بیچ میں ایک خالی
جگہ ملیگی[۵۳]، اس جوف میں ایک قسم کا عرق یا رس بھرا ہوتا ہے
(Root Pressure) جڑوں کی یہ مخصوص طینت ہے کہ وہ ہمیشہ
زمین کے اندر مٹی کو چیر پھاڑ کر اپنا گھر کرتی ہیں چنانچہ جب پودا
زمین سے اُکھاڑا جاتا ہے تو جڑوں میں نرم مٹی چمٹی ہوئی نکل
آتی ہے یہ مٹی جڑ کے ریشوں میں ایسی مضبوطی سے چمٹی ہوتی ہے کہ ذرا مشکل سے علیحدہ ہوتی ہے مٹی میں
مختلف معدنیات مخلوط ہوتے ہیں اور کم و بیش قریب قریب ہر جگہ زمین میں موجود ہوتے ہیں اگر کسی حصۂ زمین
میں مفقود ہوں تو وہ زمین زرخیز نہیں کیونکہ غذا کی نایابی کیوجہ سے کوئی درخت اس جگہ نمو نہیں
کرسکتا جب درختونکو پانی دیا جاتا ہے یا قدرتی پانی برستا ہے تو وہ زمین میں جذب ہوجاتا ہے وہاں
اسمیں مختلف گیس[۵۴] جذب ہوکر تیزابی اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ تاکہ اُس تیزابی پانی میں معدنیات ارضی
باآسانی تحلیل ہوسکیں۔

یہ اوپر بیان ہوچکا کہ معدنی مرکبات خشک حالت میں جڑوں کے اندر نہیں پہنچ سکتے کیونکہ
جڑوں کی بیرونی جلد میں از قسم سوراخ ایسا کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ کوئی شئی اُس کے اندر ہوکر جڑ میں
داخل ہوجائے۔ لہذا اُن غذاؤں کے اندر پہنچنے کا صرف ایک ذریعہ یہی ہے کہ وہ پانی میں تحلیل ہوکر
جڑوں کی باریک جلد میں سرایت کرکے اندر پہونچیں۔

---

[۵۱] سیل (Cell) [۵۲] پروٹوپلازم (Protoplasm) [۵۳] (cell-cavity)
[۵۴] (Gas) ؛

ان اصطلاحات کے بھی اردو میں الفاظ وضع کرنا آسان کام نہیں۔ دشواری یہ ہے کہ اگر مفرد لفظ اُن کے مفہوم کے لحاظ
کیلئے لکھا بھی جائے تو وہ حاوی نہیں ہوتا اور مرکب الفاظ لکھے جاویں تو مطلب فوت ہونے کا اندیشہ ہے۔
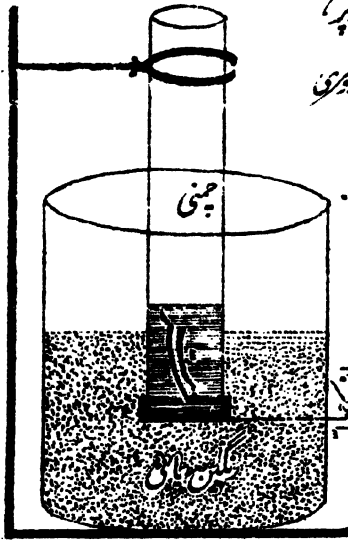
مثلاً لیمپ کی چمنی لیکر ایک جانب کھلے ہوئے منھ پر،
بکری یا کسی اور جانور کی جھلی لیکر خوب مضبوط منڈھ دو اور دوسری
جانب سے شکر یا نمک پانی میں گھول کر انڈیلو یہانتک
کہ آدھی چمنی بھر جائے اب ایک گہرا برتن لیکر اُس میں
محض پانی بھر دو اور کوئی رنگ ڈال کر ہلکا رنگ دیدو
پھر وہ چمنی اس بڑے برتن میں لٹکاؤ کچھ دیر کے بعد چمنی
کے اندر کا شربت بھی اُسی رنگ کا ہوجائے گا جس
رنگ کا بڑے برتن میں پانی بھرا ہوا تھا اس کی وجہ
یہ ہے کہ پانی شربت سے نسبتاً ہلکا ہوتا ہے لہذا اسمیں
جھلی کے اندر بآسانی اور جلد پھیل جانے یا سرایت ہونیکی قابلیت بھی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے ہر ہلکی رقیق شئے
وزنی کے مقابلہ میں قابل نفوذ جلد کے اندر ہو کر جلد پھیل جاتی ہے یہ سائنس کا ایک طے شدہ مسئلہ ہے
جسکو آسموسس کہتے ہیں جڑوں کے چھوٹے چھوٹے خانوں کی مہین جلد بعینہ وہی کام کرتی ہے جو اس تمثیل
میں جانور کی جھلی سے ظہور میں آیا ان خانوں کے اندر سیل ساپ ہوتا ہے اور باہر وہ رطوبت ہوتی ہے جسمیں
معدنی مرکبات تحلیل شدہ موجود ہیں یہ رطوبت سیل ساپ سے نسبتاً ہلکی ہوتی ہے لہذا اُن خانوں کی
قابل نفوذ جلد کے اندر ہو کر بذریعہ آسموسس سیل کے اندر داخل ہوجاتی ہے اور سیل ساپ میں گھل مل
جاتی ہے۔ اس طرح نباتات پانی میں گھلی ہوئی غذا کو جڑوں کی مدد سے چوستے ہیں اب یہ دیکھنا ہے کہ غذا
درختوں کے منھ یعنی اُن کی جڑوں سے معدہ یعنی پتیوں تک کیونکر پہنچتی ہے

تم نے تجربہ کیا ہوگا کہ مادی شے قوت جاذبہ ارضی کی وجہ سے پستی کی جانب گرتی ہے۔ اگر کوئی مٹی
کا ڈھیلا ہوا میں اُچھالا جائے تو کچھ دور اوپر جاکر پھر زمین پر گر پڑے گا۔ یہ قانون قدرت ہے اور ہر شئے اس اصول
کی پابند نظر آتی ہے لیکن نباتات میں ایک استثنا قابل غور ہے وہ یہ کہ سیل ساپ مع غذائی مرکبات کے بجائے پستی

ط Osmosis (آسموسس) ۔ ط Action of Gravity

کی جانب بہنے کے درخت کی چوٹی اور پتیوں کی جانب صعود کرتا ہے - اس میں یقیناً قدرت کا کوئی راز پنہاں ہے - ماہرین علمِ نباتات اس مسئلہ کے حل کرنے میں عرصہ سے سرگرم ہیں لیکن اب تک اس معمہ کا قابلِ قبول حل نہیں ہو سکا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جڑوں کے خانوں میں رطوبت غذائی بذریعہ آسموسس آ کر سیل میں ملتی جاتی ہے جسطرح ہوا بھرنے سے فٹ بال پھولتا ہے اسی طرح جسقدر یہ رطوبت جڑوں کے خانوں میں بھرتی جاتی ہے اسیقدر وہ خانے حجم میں پھولتے جاتے ہیں - یہ حالت جڑوں کے اُن کل خانوں کی ہوتی ہے جو مٹی سے ملحق ہوتے ہیں - یہانتک کہ ہر ایسا بیرونی خانہ پھول کر جسامت حاصل کر لیتا ہے اس حالت پر پہنچ کر ان خانوں کے پروٹوپلازم میں کچھ ایسا تغیر طبیعی واقع ہوتا ہے کہ ہر خانہ یکایک تڑک جاتا ہے اور اُن کے اندر کی رطوبت پچکاری کی طرح زور سے خارج ہوتی ہے اب تم یوں تصور کرو کہ جڑوں کے ہر جانب مٹی ہے جسمیں سے رطوبت غذائی ان جڑوں کی بیرونی خانوں میں کھنچ کھنچ کر بھر رہی ہے اور اندرونی خانوں میں سوائے سیل ساپ کے اور کوئی رطوبت نہیں - ظاہر ہے کہ جب بیرونی خانے تڑک کر اپنی رطوبت خارج کرینگے تو اس رطوبت کو اندرونی خالی خانوں کی جانب بہنا زیادہ آسان ہوگا بمقابلہ اس کے کہ وہ باہر جڑ کی جانب جائے کیونکہ اس طرف سے رطوبت غذائیہ کا جڑ کے اندر کی جانب بہاؤ مانع ہوگا بالآخر جب جڑ کے اندرونی خانے بیرونی خانوں کی خارج کردہ رطوبت کے بھر جانے سے پھول جاتے ہیں تو وہ بھی یکبارگی تڑکتے ہیں اور اُن کی رطوبت خارج ہو کر اوپر کے خالی خانوں میں بھر جاتی ہے اسی طرح جڑوں کے خانوں میں ہوتی ہوئی درخت کے تنے میں غذا پہنچتی ہے اور اوپر چڑھتی ہوئی پتیوں تک پہنچتی ہے اس سے ظاہر ہو گیا کہ جڑوں کے خانوں میں حکیم مطلق نے ایک ایسی قوت[۵۱] ودیعت فرمادی ہے جو غذا کو درخت کی جڑ سے بلندی کی جانب ڈھکیلتی ہے -

دوسری قوت جو غذائی رطوبت کے صعود میں معین ہوتی ہے وہ تبخیر[۵۲] ہے - منجملہ دیگر اعضائے نباتات کے پتیوں میں بیشمار خانے ہوتے ہیں جب غذائی معدنیات کا عرق جڑ سے پتیوں میں پہنچتا ہے تو وہاں آفتاب کی حرارت کے اثر سے بہت کچھ رطوبت ابخرات کی شکل میں منتقل ہو جاتی ہے اور یہ ابخرات

Transpiration ۵۲. Root-Pressure ۵۱

پتیوں کے مہین مہین مسامات کے ذریعہ سے فضائے عالم میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسقدر رطوبت پتیوں کے خانوں میں بخارات بنکر کم ہو جاتی ہے اسیقدر خانوں میں خلا ہوتا جاتا ہے۔ یہ خلا شاخوں اور جڑوں کی رطوبت پر انجذابی اثر ڈالتا ہے وہ کھچکر پتیوں کے خالی خانوں میں آجاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تبخیر، رطوبت غذائی کو جڑوں سے درخت کی چوٹی کیجانب کھینچتی ہے اور قوت متذکرہ بالا اوپر ڈھکیلتی ہے۔ ان دونوں قوتوں کے زیر اثر غذا نباتات کے معدہ یعنی پتیوں تک پہنچتی ہے۔

محققین نے اجسام نباتات کی تشریح کرکے اُن اجزاء[1] کو دریافت کیا جو نباتات کی ساخت میں شریک ہیں کل اجزاء کا ذکر کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے لہذا ہم صرف اُن اجزاء کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں جو نباتات کی صحیح نشو و نما کے لئے نہایت ضروری ثابت ہوئے ہیں۔ ہوا میں کئی گیس ہوتے ہیں منجملہ اُن کے ایک کاربن ڈائی اکسائڈ۔ کاربن (کوئلا) اور آکسیجن کا مرکب ہوتا ہے ہری ہری پتیوں میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہرے رنگ کے مادہ[2] اور آفتاب کی روشنی و حرارت کی مدد سے اس گیس کو جذب کر لیتی ہیں اور اُس کے اجزاء کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیتی ہیں کاربن جُدا ہو کر پتیوں کے خانوں میں رہجاتا ہے اور آکسیجن گیس خارج ہو کر پھر ہوا میں منتشر ہو جاتا ہے علاوہ کاربن کے باقی کل ضروری اجزاء اُن معدنیات کی ترکیب میں شامل ہوتے ہیں جنکو جڑیں مٹی سے جذب کر کے پتیوں میں بھیجتی ہیں اس طرح جب کل اجزاء پتیوں کے خانوں میں جمع ہو جاتے ہیں تو ہضم غذا شروع ہوتا ہے یعنی اول مرکبات کی ترکیب شروع ہوتی ہے جو نباتات بطور غذا اپنے کام میں لاتے ہیں منجملہ ان تیار شدہ مرکبات کے جو پانی میں قابل تحلیل ہوتے ہیں وہ حل ہو کر پتلی پتلی نالیوں یا رگوں کے ذریعہ سے درخت کے پورے جسم میں منقسم ہو جاتے ہیں اور درخت کا ہر خانہ اپنی اپنی ضرورت کے موافق اس غذا سے اپنے اجزا مثلاً پروٹوپلازم وغیرہ بنا کر جسامت میں نمو حاصل کرتا ہے اس سے یہ امر غالباً واضح ہو گیا ہو گا کہ جو نتیجہ حیوانات تغذیہ سے حاصل کرتے ہیں یعنی جسم

---

[1] کاربن یا کوئلہ۔ آکسیجن۔ ہائڈروجن۔ نائٹروجن گیس۔ گندھک۔ فاسفورس۔ کیلشیم۔ پوٹیشیم۔ میگنیشیم۔ اور لوہا۔

[2] Chlorophyll (کلوروفل)

کانشوونما بعینہ وہی فائدہ نباتات کوبھی غذا سے پہنچتا ہے پھر یہ کہنا کہ نباتات غیرذی حیات طبقہ ہی لاعلمی نہیں تواور کیا ہے ؟

دنیا حیرت کرے گی کہ جس طرح حیوانات میں بعض افراد کاہل و اپاہج ہوتے ہیں اسی طرح نباتات میں بھی اکثر افراد خود کسب غذا نہیں کرتے بلکہ دیگر افراد کی پکی پکائی غذا میں حصّہ لگاتے ہیں ایسے درختوں میں تیزی کا کہیں لگاؤ تک نہیں ہوتا - بات یہ ہے سبز پتیوں میں ایک مادہ کلوروفل[۵۲] ہوتا ہے جسکی تولید کیلئے آفتاب کی روشنی وحرارت اور غذا میں لوہے کی موجودگی نہایت ضروری اسباب ہیں درخت میں جس حصے میں کسی وجہ سے اس مادہ کی تولید نہیں ہوتی وہ حصّہ زرد پڑجاتا ہے اسی مادہ کی مدد سے پتیاں معدنی اجزا سے درخت کی غذا تیار کرتی ہیں - ان درختوں میں جنکو ہم کاہل یا اپاہج کہ رہے ہیں یہ مادہ تو ہوتا نہیں پھر وہ بیچارے اپنی غذا خود کیونکر تیار کریں غذا تیار کرنے کی استطاعت نہیں ہوتی اور خواہش بقا کا تقاضا ہوتا ہے کہ غذا الاؤلا محالہ دوسروں کی غذا تکنا پڑتی ہے اچھا اگر یہ بے غیرتی بھی گوارا کرلیں تو دوسری مصیبت کا سامنا ہوتا ہے وہ یہ کہ دیگر درختوں تک اُن کی رسائی کیونکر ہو؟ - خدانے پیر دئے ہوتے تو کسی سے جاکر سوال کرتے آخر بھوک نے خود ترکیب بتادی وہ یہ کہ اس قسم کے درختوں میں ایک نئی قسم کی جڑ پیدا ہوجاتی ہے یہ جڑ زمین کے اوپر اوپر طول میں بڑھتی چلی جاتی ہے یہانتک کہ جب کسی دوسرے کھاتے پیتے درخت کے پاس پہنچتی ہے تو اس کے جسم کے اندر داخل ہوجاتی ہے اور اُس کی غذا اپنے درخت میں پہنچانے لگتی ہے کچھ عرصہ کے بعد دونوں میں اسقدر اتحاد ہوجاتا ہے کہ کوئی شخص نہیں پہچان سکتا کہ وہ جڑ ان دونوں درختوں میں سے کس درخت کا جزو ہے اس قسم کے درخت[۵۱] ہندوستان کے پہاڑی اطراف میں اکثر پائے جاتے ہیں مثلاً ایک درخت جسکو اکاش بیل کہتے ہیں کوہ ہمالیہ کے نواح میں جابجا دیکھا گیا ہے -

نباتات کے بعض افراد شکار میں بھی خاص دلچسپی لیتے ہیں - حیوانات میں جانور اپنے سے کمزور جانور کا پنجوں اور منھ سے شکار کھیلتا ہے - انسان بندوق وغیرہ کام میں لاتا ہے لیکن درختوں کا

---

۵۱ Parasite (پیراسائٹ)، ۵۲ Chlorophyll. کلوروفل

آلۂ شکار سب سے علحدہ ہے انکا آلہ پتیاں ہیں۔ انسان کے شکار اور درختوں کے شکار میں ایک فرق اور بھی ہے وہ یہ کہ انسان اکثر اپنی تفریح طبع کے لیے بھی شکار کھیلتا ہے لیکن نباتات کا مقصدِ شکار ہمیشہ حصولِ غذا ہوتا ہے اسیوجہ سے ان درختوں کو گوشت خوار[ل] کہتے ہیں یہ گوشت خوار درخت اُن زمینوں پر پائے جاتے ہیں جنمیں نائٹروجن گیس کسی شکل میں بھی یا تو ہوتا ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ نائٹروجن غذائے نباتات کا نہایت ضروری جز ہے جسکے بغیر صحیح نشو نما غیر ممکن ہے لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کے لئے رزّاق عالم نے ان درختوں کو ایسی پتیاں عطا کردی ہیں جنکے ذریعہ سے وہ چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو پکڑ لیتے ہیں اور ان کیڑوں کا نائٹروجن چوس کر اپنی غذا کے صرف میں لاتے ہیں ان درختونکی پتیوں میں خدا نے ایسی ایسی صنعتیں رکھی ہیں کہ مُنھ سے بے تحاشا حمد نکل جائے اور کہنا پڑے کہ نباتات بیشک خدا کی ذیحیات اور نہایت بہتر مخلوق ہے۔

فتبارک اللہ احسن الخالقین

(باقی باقی)

ل Carnivorous (کارنی وورس)

اورنگ زیب اور اکبر کا خزانہ

ذیل میں ہم جیرالڈ انیجر (Gerald Aungier) پریذیڈنٹ کونسل ایسٹ انڈیا کمپنی بمقام سورت کے اس مراسلہ کا اقتباس شایع کرتے ہیں جو پریسیڈنٹ مذکور نے ۲۲ رجنوری ۱۶۷۷ء عیسوی کو صدر دفتر لندن کے نام بھیجا تھا، خوش قسمتی سے یہ مراسلہ انڈیا آفس کے محافظ خانہ میں محفوظ ہے [1]

تمہارے "سونے" میں جسمیں پہلے تم کو کبھی کبھی فائدہ ہوا کرتا تھا، دو سال سے بہت نقصان ہو رہا ہے، ہمارے ہوش میں کبھی سونا اتنا ارزاں درب حقیقت نہیں ہوا تھا، جتنا اس سال ہے۔ اس کا سبب قابل وثوق ہے کیونکہ ہم کو قابل وثوق لوگوں سے اسکی اطلاع بھی ملی ہے، سال گذشتہ سلطنت کا شیرازہ ابتر رہا۔ بادشاہ نے خود سر پٹھانوں اور سیوا جی سے پیہم ناکام لڑائیاں لڑ لڑ کر اور مسلمانوں سے اسلامی جزیہ میں تمام محصولات مثلا راہداری و جنگی وغیرہ نہ وصول کر کے سلطنت کے خزانہ کو بالکل خالی کر دیا تھا۔ بدنیت عمال نے غبن کر کے اپنی جیبیں بھر لیں سپاہ کی تنخواہ چڑھ گئی، اور اسمیں بغاوت کی وبا پھیلنے لگی، ایسی صورت میں اورنگ زیب سوائے اسکے کچھ نہ بن پڑی کہ خود بنفس نفیس جا کر اکبر اعظم کا خزانہ کھولے، جب وہ تہ خانہ میں پہونچا، تو ایک مسی تختی پر جلی حرفوں میں کندہ تھا،

"جو شخص دروازہ کو کھولنے اور خزانہ کو لیجانے کا قصد کریگا اسکے لئے تباہی اور موت ہے"

بادشاہ پہلے اس کتبہ سے جھجکا، لیکن مرتا کیا نہ کرتا مجبوری جو نہ کروا ڈالے وہ کم ہے دل میں ٹھان ہی لی کہ چاہے جو کچھ ہو خزانہ ضرور کھولوں گا، جان بھی پیاری ہوتی ہے، یہ سوچا کہ

---

[1] او، سی ۰۰ ۲۵ ۰ ۴۲

دروازہ کھولنا خطرہ سے خالی نہیں۔ لہٰذا اس سے بہتر یہ ہے کہ دیوار میں نقب لگا دی جائے اس طرح نقب کے ذریعے سے بیشمار اشرفیاں نکالی گئیں اور انسے فوج کی تنخواہ دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سونا مٹی سے بھی ارزاں ہو گیا، اور اشرفی جو پندرہ روپیہ کے نرخ پر بکتی تھی گیارہ و بارہ روپیہ کے بھاؤ پر فروخت ہونے لگی"

"لوگ کہتے ہیں کہ خزانہ کا کتبہ اپنی صداقت کا ثبوت دے رہا ہے اور خود شاہی محل میں اسکے اثرات ظاہر ہیں ولی عہد سلطنت سلطان محمد[1] نے جو پہلے زندان بلا میں مقید تھا لیکن حال میں اسکی جان بخشی ہو گئی تھی انتقال کیا، شہزادہ کی موت بہت عبرت خیز اور پُر اسرار ہے۔ نہ جانے اپنی موت مرا یا کیا ہوا؟ باقی ماندہ شہزادوں کے دماغوں میں نہ معلوم کیا سودا سمایا ہوا ہے۔ ٹکڑیاں بن رہی ہیں رعایا میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ سب کہتے ہیں کہ انتزاع سلطنت قریب ہے ظاہر ہے کہ اسکا نتیجہ تجارت کی بربادی ہے۔ سرمایہ دار اپنی خیر منا رہے ہیں اور بجائے روپیہ کو تجارت میں لگانے کے اپنی دولت کو چھپائے بیٹھے ہیں"

یہ مراسلہ مسٹر ڈبلو فاسٹر (W. Foster) نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل کی اشاعت اپریل ۱۹۲۵ء میں ایک مختصر نوٹ کے سلسلہ میں شایع کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں سونا کثیر مقدار میں ملک میں موجود تھا جسکا اقتصادی نتیجہ یہ ہوا تھا کہ سونا چاندی کی قیمت میں بہت گر گیا تھا، اور ہندوستان کی خلقت کے یہ وِرد زبان تھا کہ اورنگ زیب نے اپنے اجداد اولوالعزم کے کم و بیش ایک صدی کے جمع کیے ہوئے خزانہ کو کھول کر اسمیں تصرف کیا تھا۔ اس واقعہ کی صداقت کہاں تک ہے؟ اسکا جواب آسان نہیں مشہور مؤرخ پروفیسر جادو ناتھ سرکار (وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی) نے قدیم تاریخی فارسی تصانیف کے مطالعہ کے بعد تحقیق کی ہے کہ یہ افسانہ تراشا ہوا اور بے بنیاد ہے۔ انکی رائے میں اورنگ زیب نے اس واقعہ کے بیس سال بعد تک اکبر، جہانگیر، اور شاہجہاں کے خزانہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

مؤرخ منوسی (Manucci) پروفیسر سرکار کی خیال کی تصدیق کرتا ہے،

---

[1] سلطان محمد نے دسمبر ۱۶۷۶ء میں انتقال کیا۔

لکھتا ہے:۔ کہ ۵۴

"جب شہنشاہ اورنگ زیب ۱۶۸۱ء میں اجمیر سے دکن روانہ ہوا ہے تو اسکے پاس ایک بہت بڑا خزانہ تھا لیکن جنگ میں یہ خزانہ اس طرح خالی ہوا کہ آخر کار اسکو اکبر، نورجہاں، جہانگیر و شاہجہاں کے خزائن کو کھولنا پڑا۔"

کتبہ کا قصہ کسی پرانے افسانہ کا تتبع یا کسی قہوہ خانہ کی اختراع معلوم ہوتا ہے۔"

رومیوں کے قدیم آلات موسیقی

مشہور مورخ المسعودی اپنی تصنیف مروج الذہب میں ایک مقام پر رومیوں کے قدیم آلات موسیقی پر بہت بیش قیمت معلومات پیش کرتا ہے، ہنری جارج فارمر کا خیال یہ ہے کہ یہ ابن خردازدیہ کے اس خطبہ کا اقتباس ہے جو اس نے خلیفہ معتمد باللہ (۸۹۲ء ۸۷۰ء) کے حضور پیش کیا تھا، اس شخص کا ذریعہ اطلاع کیا ہے اسکے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلومات اس نے اپنے سفر میں بہم پہونچائی ہیں اور زیادہ تر جیسا کہ وہ خود اپنی کتاب المسالک و الممالیک میں لکھتا ہے ایک شخص الحرمی کی اطلاعات کی بنا پر ہیں علاوہ بریں خوررازدیہ نے محمد بن موسی بن شاکر سے بھی تھوڑا بہت اکتساب کیا ہے۔ بہر کیف اقتباس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"وللروم من الملاهي الارغن وعليه ستة عشر وترا ولها صوت بعيد كما هند وهو من صنعة اليونانيين وسلبا ولها اربعة وعشرون وترا ولهم اللورا وهي الرباب وهي من خشب ولها خمسة اوتار ولهم قيثارا لها اثنا عشر وترا ولهم صلنج وهو من

---

۵۴ استوریا دو موگر (Storia do Mogor) مصنفہ Manucci جلد دوم صفحہ ۲۵۵۔

۵۵ یہ شخص خلیفہ کا بہت منہ چڑھا تھا، اور اپنے زمانہ میں علم موسیقی کا ماہر تصور کیا جاتا تھا۔ یہ اسحاق الموصلی کا شاگرد تھا اور علم موسیقی میں دو کتابوں کا مصنف ہے کتاب آداب السماع (۱) کتاب اللہو والملاہی (۲)۔ پہلی کتاب ناپید ہو گئی دوسری کتاب الفہرست صفحہ ۱۴۹ کے مطابق ایک شخص حبیب آفندی (سکندریہ) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (الہلال جلد ۲۸ صفحہ اشاعت ۲۱۳)

۵۶ خاندان موسیٰ اپنے دور میں یونانی علوم و فنون کے جاننے والے خیال کیے جاتے تھے (المشرق جلد ۱۶)

جلود العجاجیل وکل ھذہ معازف مختلفۃ الصنعۃ ولھم الارغن وھو

ومنا صنع من الجلود والحدید وتفسیرہ الف صوت »

رومیوں کے قدیم آلات موسیقی حسب ذیل تھے۔

ارغن[۵] :- یہ قدیم یونانی صنعت کا نمونہ ہے اسمیں سولہ تار اور بلند آواز ہوتی ہے

سلباق :- اسمیں چوبیس تار ہوتے ہیں

لورا :- یہ رباب بھی کہلاتا ہے۔ یہ لکڑی کا ہوتا ہے اور اسمیں پانچ تار ہوتے ہیں

قیثارہ :- اسمیں بارہ تار ہوتے ہیں

صلنج :- یہ بچھڑے کی کھال کا بنا ہوتا ہے

ان تمام آلات کی ساخت مختلف ہوتی ہے۔ انکے علاوہ "ارغن" ہے جسکو ہزار آواز کہتے ہیں۔ یہ آلات نویں صدی عیسوی کے ہیں۔ بادی النظر میں یہ نام بہت غریب معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ہم ابوعبداللہ خوارزمی[ا] کی ہدایت پر چلیں تو ہم کو انمیں سے ایک لفظ بھی غیر مانوس نظر نہ آئیگا۔

ارغن :- ارگن باجا ہے۔

سلباق :- مفاتیح العلوم کے مطابق شلیاق اصلی لفظ ہے یہ "چنگ" کا مشابہ ہے۔

لورا :- رباب ہے۔

صلنج :- صلنج ہے

قیثارہ :- طنبور[۲] سے مشابہ ہوتا ہے

ارغن :- ڈھول نما۔

لہ اشارہ خوارزمی کی کتاب مفاتیح العلوم کی طرف ہے

سہ کیا عجب ہے کہ جو آلہ موجودہ صورت میں طنبورہ کہلاتا ہے اپنی قدیم عہد کی شکل میں قیثارہ ہی ہو۔

سہ اردو میں ارگن اور انگریزی میں (Organ.) غالبا یہ سب ایک ہی ہیں۔

نظر جوہر شناس

بزم ایران آراستہ آیۃ اللہ زادہ یزدی آقائے حاجی سید محمد رضا طباطبائی، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۲۰×۲۶/۸ حجم ۳۴ جزو (۵۴۴ صفحہ) کاغذ ۲۶×۴۰ - ۵۵ پونڈ سفید گلیز

یہ اُس شخص کی تالیف اور گرانقدر تالیف ہے جس کی تمثیل خیابان کے سرورق کی زینت ہے۔ آقائے طباطبائی ممالک اسلامیہ میں کسی بھی تعارف سے بالکل بے نیاز ہیں۔ آپ اُس خاندان کے یادگار ہیں جس نے صدیوں سے اپنی زندگی کو خدا کے پاک مذہب کی تبلیغ اور اُسکے بندوں کی ہدایت کے لیے وقف کر دیا ہے، کتاب ۳۴ جزو پر مشتمل ہے۔ اور فارسی کی روزمرہ میں تالیف کیلئی ہے۔ زبان کی لطافت سے صرف وہی حضرات لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو محقق طباطبائی کی طرح فارسی ادب پر قدرت رکھتے ہوں اور اہل زبان ہوں ایک عالمانہ مقدمہ میں تالیف کی وجہ و غایۃ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسکے بعد مواد کتاب کو حسب ذیل تفصیل کیساتھ تقسیم کیا گیا ہے۔

بابِ اوّل۔ حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی۔ یہ باب لطائف کا معدن ہے۔ تاریخ اسلام کے تمام وہی لطائف جو چند در چند وجوہ سے دل آویزی رکھتے ہیں جمع کر دیئے گئے ہیں ان لطیفوں کی مجموعی تعداد ۶۰۳ ہے جو یقیناً سخت کاوش کیساتھ فراہم کئے گئے ہیں۔

باب دوم۔ مقالات حکمت آمیز پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں ایران کے مایۂ افتخار شعرا کے مختلف اشعار ہیں جنکو حروف تہجی کے حساب سے جگہ دی گئی ہے کتاب کے جواہر مضامین کی قدر و قیمت دل آویز طباعت سے دوبالا ہو جاتی ہے، اگر مبالغہ نہ خیال کیا جائے تو ہم بلا تامل کہہ دینگے کہ ایران و مصر میں اس شان کی کتاب ممکن ہے کہ چھپی ہو لیکن ہندوستان میں اس حسن کی کتاب ہماری نہ آجتک نظر سے گذری نہ ہم یہاں کسی ہندوستانی مطبع سے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ پیش کر سکتا ہے ولایتی چکنا کاغذ اور بہم نظر زیب کتابت، ولائتی خط کا جربہ معلوم ہوتا ہے۔

ہم ہندوستانی یونیورسٹیوں سے سفارش کرینگے کہ وہ امتحانات ڈگری کے نصاب فارسی میں اسکو داخل کرنے پر غور کریں۔

قیمت مجلد ۸ روپے، غیر مجلد ۶ روپے ملنے کا پتہ آقا میرزا محمد علی کشمیری رامپور اسٹیٹ

سبد گل مصنفہ مولوی سید اولاد حسین صاحب شاعر لکھنوی۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ - ۵ جزو (۸۰ صفحہ)

یہ کتاب جناب شاعر کی نظموں کا مختصر مجموعہ ہے۔ نظموں کے بعض عنوانات مثلاً ہمارا وطن۔ گنگا۔ میدان کربلا قومیت کے جذبہ کو نمایاں کرتی ہیں۔ تاروں بھری رات، برسات، مناظر قدرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ صبح کے مختلف مناظر مختلف نظموں میں دکھلائے گئے ہیں جنہیں نو د صبح، نباتات اور صبح، پرندوں میں صبح اور چوپایے اور صبح، پہاڑوں کی صبح غیر ممالک کی صبح، ہندوستان کی صبح، میری صبح، انکی صبح خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ شاعر کی شاعری کا یہ رنگ بالخصوص قابل تحسین ہے۔ لکھنو غزل کا گہوارہ ہے ہمارے اساتذہ میں صرف چند ہیں جنھوں نے اس صنف شاعری یا "نظم" کیطرف توجہ کی ہے۔ ہم شاعر کو انکی سبد گل پر مبارکباد دیتے ہیں۔

اثرستان: دیوان نواب جعفر علیخان صاحب اثر لکھنوی ڈپٹی کمشنر اناؤ۔ تقطیع $\frac{22 \times 18}{8}$

یہ جناب اثر لکھنوی کا پہلا دیوان ہے جناب عزیز اپنے مقدمہ میں شاعر کا تعارف کراتے ہوئے انکے خاندانی حالات پر بھی کافی روشنی ڈالتے ہیں ہمارے خیال میں اثر اب تعارف سے بالکل بے نیاز ہیں اگر ہم کثیر اردو شعرا میں مذاق سلیم رکھنے والوں کی ایک فہرست مرتب کریں تو ہم بلا تامل کہینگے کہ یہ فہرست بہت ہی مختصر ہوگی۔ لیکن اثر کا مذاق سخن، اثر کی تخئیل، اثر کی زبان، انکو اس فہرست میں ایک ممتاز جگہ دیتی ہیں۔ ہم شاعر کے کلام پر اس زیادہ تفصیلی تنقید نہیں پیش کر سکتے۔ دیوان کے منتخب اشعار کو تنقید کے ساتھ پیش کرنا بھی ایک طویل مبحث ہے جسکے لیے ہم اپنے ناظرین سے معذرت کرنے پر مجبور ہیں تاہم اس اختصار پر قناعت کرتے ہوئے اس شعر کو تحریر کیئے بغیر نہیں رہ سکتے ؎

تیری مرضی ہو جہاں بھیجدے اے داور حشر　　مجھسے دہرائی نہ جائینگی خطائیں اپنی

کاش ہم اس شعر کے کیفیات کو پیش کر سکتے۔

شاہان مالوہ: مولفہ امیر احمد صاحب بی اے کاکوری جج نیج سنٹرل انڈیا ایجنسی مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ

کتاب نیر نظر مالوہ کی ایک مختصر تاریخ ہے ہمکو افسوس ہے کہ ہم اس اشاعت میں کوئی تفصیلی تنقید نہیں پیش کر سکتے۔ ممکن ہے کہ ہم آئندہ نمبر میں قابل تنقید کتابوں کیساتھ اسکے تاریخی مواد کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔

باہتمام محمد جواد نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں چھپا اور سید احمد حسین بیلشہری نے دفتر خیابان